Monthly AWAMI JAMHURIAT

ماہنامہ

عوامی جمہوریت

جولائی 2017

☆

اشاعت کا
49 واں سال

یہ سب ایک ہیں

پاناما کرپشن

شمارہ نمبر-05

جلد نمبر 13

MONTHLY
AWAMI JAMHURIAT
LAHOR

ماہنامہ عوامی جمہوریت لاہور

CPL NO. 279

جولائی 2017

قیمت 30 روپے

ایڈیٹر
اختر حسین

مجلسِ ادارت
عابد حسن منٹو
مسلم شمیم، صباء الدین صباء، توقیر چغتائی
عابد شکیل فاروقی

منیجنگ ایڈیٹر
اے۔ آر۔ عارف

سرکولیشن منیجرز
اشتیاق اعظمی، ناصر نوشاد

اس شمارے میں

اداریہ

کرپشن، احتساب، جے آئی ٹی اور وزیراعظم کی نااہلی	اختر حسین ایڈووکیٹ	1
پانامہ لیکس کو کیوں سامنے لایا گیا	نجم الحسن عطا	3
الجزیرہ، آزاد میڈیا اور سعودی بحران	توصیف احمد خان	5
برطانوی انتخابات اور لیبر پارٹی کی کارکردگی	ریاض احمد شیخ	7
پاکستان میں جاگیردارانہ باقیات	اثر امام	9
عید ملن پارٹی	رپورٹ: عابد شکیل فاروقی	13
1917 کے انقلاب اکتوبر کے ادب پر اثرات	مسلم شمیم	14
چراغ آندھی میں جل رہا ہے	صباالدین صبا	16
سیاست کیوں کی جائے؟	گلزار چنا	18
سینٹ کی قائمہ کمیٹی عابد حسین منٹو کی بریفنگ	رپورٹ: فرمان علی	20
AWP کے اسیر رہنما غلام دستگیر محبوب کی رہائی	رپورٹ: فرمان علی	22
سعید احمد ساجد اعوان ایک انقلابی مزدور رہنما	رپورٹ: فرحت عباس	24

لاہور آفس: 5- میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان
فون: 042-37353309-37357091
فیکس: 94-42-36361531
کراچی آفس: 204-201، پینوراما سینٹر نمبر 1، فاطمہ جناح روڈ، صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

اداریہ

کرپشن، احتساب، جے آئی ٹی اور وزیراعظم کی نااہلی

گذشتہ کئی ماہ سے پورے ملک میں کرپشن کا واویلا اس طرح سے رہا کہ پاکستان میں شاید اس کے علاوہ کسی اور مسئلہ کا وجود ہی نہیں تھا۔ ہم کرپشن کی معاشی وسماجی پراگندگی اور لعنت کو کم اہمیت نہیں دیتے بلکہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان پر بڑا سیاست دان خواہ اس کا تعلق ا، ض، ع، ق، ن، مسلم لیگ سے ہو یا پیپلز پارٹی، تحریک انصاف، جماعت اسلامی یا جمعیت علماء اسلام وغیرہ سب اس حمام میں برابر کے شریک ہیں۔ پاکستان کے اندر معاشی لوٹ مار کے نتیجے میں ملک سے باہر دولت کی کروڑوں، اربوں میں غیر قانونی ترسیل کئی دھائیوں سے جاری ہے اور اس میں فوجی وسول نوکر شاہی سیاست دان اور کاروباری/سرمایہ دار شخصیات سبھی شامل ہیں، احتساب کا قانون 1999ء میں آیا اور یکے بعد دیگرے فوجی وسیاسی حکومتیں بدلتی رہیں اور ہر ایک نے دوسرے کے خلاف اس قانون کے تحت مقدمات بناتے رہے مگر کرپشن میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا رہا۔ احتساب قانون بنانے والا جنرل پرویز مشرف خود آج بیرون ملک اربوں کی جائیداد کا مالک ہے اور یہاں غداری کے مقدمات قائم ہونے کے باوجود ملک سے باہر عیش کی زندگی گذار رہا ہے۔

پھر اچانک سے پانامہ لیکس اور برطانیہ کے درجن آئیلینڈز میں آف شور کمپنیوں کا شور برپا ہوا جن کمپنیوں کی ملکیت میں سیاست دان، جرنیل، افسر شاہی، جج، وکیل اور سرمایہ کار سبھی شامل ہیں۔ دراصل یہ آف شور کمپنیاں اور سوئز بنکوں میں دولت کے انبار نہ صرف ذاتی کرپشن بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے رحم لوٹ مار کا نتیجہ ہیں بلکہ بڑے سرمایہ دار و سامراجی ممالک نے خود اس نظام کو اسطرح وضع کیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کرپٹ حکمران اور سرمایہ دار اپنی غیر قانونی دولت بغیر کسی روک ٹوک اور ٹیکس ادا کیئے وہاں لگا سکیں جسکا حتمی فائدہ ان ہی بڑے سرمایہ دار ممالک کو ہوتا ہے اس تمام تر شور شرابے کے باوجود ابھی بھی ہر سال لاکھوں ڈالر منی لانڈرنگ کے ذریعے ملک سے باہر جا رہے ہیں۔

میاں نواز شریف اور ان کے خاندان کے افراد کے خلاف موجودہ آف شور کمپنیوں اور لندن فلیٹس کی ملکیت کے بارے مقدمہ ماضی کے مختلف مقدمات کا ہی تسلسل اور ان کی نئی شکل ہے جہاں کرپشن کی بنیادوں کے خاتمے کی بجائے وزیراعظم کو برخاست کرنے کو اولیت دی جاتی رہی اور اس دفعہ راستہ سپریم کورٹ کا اختیار کیا گیا۔ جس کی ذمہ دار خود نواز شریف حکومت پر بھی ہے کیونکہ ایک سطح پر حزب اختلاف اس معاملے کو پارلیمنٹ میں لے جانا چاہتی تھی۔ مگر حکومت نے خود نا کام بنایا اور سپریم کورٹ جانے کو پارلیمنٹ پر ترجیح دی۔ ایک طرف حزب اختلاف وزیراعظم اور ان کے خاندان کے افراد کے خلاف دولت کے ناجائز ارتکاز اور وزیراعظم پر کاذب صدیق اور امین نہ ہونے کے الزامات لگاتی رہی اور دوسری طرف حکمران جماعت نے اسے جمہوریت کے خلاف سازش قرار دیا۔ مگر حزب اختلاف اور حکمران جماعت دونوں اب اپنے ہی بچھائے گئے جال میں پھنس گئے ہیں۔ کرپشن کے حوالے سے یہی الزامات خود تحریک انصاف اور پیپلز پارٹی اور دیگر جماعتوں کی قیادت پر بھی ہیں اور اسٹیبلشمنٹ نے جب چاہا ان کی گردن کے گرد پھندا تنگ کر سکتی ہے۔ جہاں تک جمہوریت کے خلاف سازش کا تعلق ہے گذشتہ سینتالیس سالوں

سے ہر بڑی سیاسی جماعت بشمول مسلم لیگ نے فوجی اسٹیبلشمنٹ سے مل کر دوسرے کے خلاف کی ہے دراصل ہمارے حکمران طبقات کی سیاسی جماعتوں میں نہ تو جمہوریت کے ساتھ کمٹمنٹ ہے اور نہ ہی عوام کے بنیادی معاشی سماجی حقوق کے ساتھ، وہ تو محض اپنی اور خاندانی یا گروہی لوٹ مار کیلئے کسی نہ کسی طرح سے حکمرانی چاہتے ہیں۔

اپریل میں سپریم کورٹ کے اکثریتی فیصلے کے تحت جب جے آئی ٹی تشکیل دی گئی تو حکمران جماعت سمیت تمام فریقوں نے مٹھایاں تقسیم کیں اور جب جے آئی ٹی نے تفتیش اور تحقیق شروع کی تو اس کی تشکیل پر بھی اعتراض آنے لگے اور پھر الزامات اور دھمکیاں بھی ہونے لگی۔ اب جے آئی ٹی کی رپورٹ آنے کے بعد سپریم کورٹ نے متفقہ فیصلے کے ذریعے وزیراعظم نواز شریف کو آئین کے آرٹیکل 62(i)F کے تحت نا اہل قرار دے دیا ہے اور ان کے اور ان کے خاندان کے افراد بیٹے، بیٹی، داماد اور جناب اسحاق ڈار کے خلاف احتساب عدالت میں ریفرنس داخل کرنے اور مقدمہ اپنی نگرانی میں چلانے کا حکم دیا ہے۔

سپریم کورٹ کا وزیراعظم کی نااہلی کا فیصلہ ان کے اپنے بیٹے کی دبئی میں قائم کردہ کیپٹل FZE کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین کی حیثیت سے دس ہزار درہم جو انہوں نے اپنی تنخواہ کے وصول کرنے تھے۔ وصول نہ کرنے کو جواز بنایا ہے کہ یہ رقم انہوں نے موصول کرنی تھی لہٰذا یہ دس ہزار درہم ان کی ملکیت اور اثاثہ یعنی Receiable Asset ہے اور انہوں 2013ء کے انتخابات میں کاغذات نامزدگی پُر کرتے وقت عوامی نمائندگی کے قانون ROPA کی شق 12(2)(7) کے تحت اثاثہ جات کے فارم اور بیان حلفی میں ظاہر نہیں کئے ہیں۔ لہٰذا ان کا حلف نامہ جھوٹا ہے اور وہ آئین کی شق 62(1) کے تحت امین اور صدیق نہیں رہے۔ لہٰذا ان کو بحیثیت رکن پارلیمنٹ اور وزیراعظم برطرف کیا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک وزیراعظم کو برطرف کرنے کے بارے میں سپریم کورٹ کی یہ دلیل احترام کیساتھ انتہائی کمزور ہے اور اس فیصلے کے قانونی پہلوؤں پر تنقید اور بحث ہوتی رہے گی اور شاید نظرثانی کی درخواست بھی داخل ہو۔ لیکن اس طرح کے فیصلے سے جمہوری ادارے جو پہلے ہی کمزور ہیں مزید کمزور ہو جائیں گے۔ پاکستان کی 70 سالہ تاریخ میں 16 وزراءاعظم آئے جن میں پہلے وزیراعظم جناب لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا اور باقی 17 دفعہ وزراءاعظم کو یا تو برطرف کیا گیا یا زبردستی استعفیٰ لے لیا گیا۔ صرف فوجی ڈکٹیٹروں فیلڈ مارشل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف نے ہی غیر محدود عرصے تک حکومتیں کیں اور کبھی بھی سیولین منتخب حکمرانوں کی فوجی اسٹیبلشمنٹ پر بالادستی قائم نہ ہو سکی، یہی اب بھی بنیادی تنازعہ تھا۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر وزیراعظم کی برطرفی میں ایک یا دوسری پارٹی اسٹیبشلمنٹ کے ساتھ سازش میں شریک رہی ہے۔

ہم کئی سالوں سے اس بات کا مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے دور میں جو غیر جمہوری اور عوام دشمن آئینی ترامیم کی گئیں تھیں ان کو ختم کیا جائے خاص کر اٹھارویں آئینی ترمیم کے وقت آئین کے آرٹیکلز 62 اور 63 نیز فیڈرل شریعت کورٹ کے خاتمے کا مسلسل مطالبہ کیا گیا تھا۔ بیشتر سیاست دان خود بھی آرٹیکلز 62 اور 63 کے خلاف تھے کہ اس کی تعریفوں میں کوئی بھی پورا نہیں اترتا اور شریعت کورٹ نے تو پارلیمان کے مقتدرِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت ہی کو ختم کر دیا ہے کیونکہ اس کے فیصلوں کو تو پارلیمان سے بڑھ کر قانون کی حیثیت دے دی گئی ہے اور اسی عدالت نے زرعی اصلاحات کو بھی خلاف اسلام قرار دے دیا ہے مگر پارلیمان سیاسی جماعتوں جن میں مذہبی پارٹیوں کے علاوہ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی شامل ہیں تسلیم نہیں کیا اور اس وقت یہ شقیں ختم نہیں کیں اب ایک دوسرے کو الزام دے رہا ہے اور خود اس کا شکار ہیں۔ ہمارا اب بھی مطالبہ ان تمام غیر جمہوری اور عوام دشمن آئینی ترامیم کے خاتمے کے ساتھ ساتھ جمہوری اداروں کی مضبوطی کا ہے۔

ہمارے نزدیک نواز شریف، ان کے خاندان کے افراد اور دیگر کے خلاف احتساب ریفرنسوں کے باوجود موجودہ جاگیرداری و بڑی زمیندارانہ باقیات اور سرمایہ دارانہ نظام کی موجودگی میں یہ کرپشن اسی طرح سے جاری رہے گا اور حکمران طبقات کی یہ سیاسی پارٹیاں جمہوریت اور جمہوری اداروں کے خلاف اسی طرح سے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ گٹھ جوڑ اور سازشیں اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک ملک میں محنت کشوں اور تمام محنت کار عوام کی متبادل سیاسی طاقت نہیں بنتی جس کی کمٹمنٹ عوام سے ہو، عوام کیلئے مفت تعلیم کے حصول سے ہو، تعلیمی نظام کو سائنسی اور سکولر بنیادوں پر استوار کرنے سے ہو، تعلیم کے بعد روزگار کی ضمانت سے ہو، مفت علاج سے ہو، خلق خدا کیلئے سر پر چھت سے ہو، بنیادی زرعی اصلاحات ہوں، زمین کی کسانوں/ہاریوں، کھیت مزدوروں میں مفت تقسیم سے ہو، صنعتی ترقی سے ہو، علاقائی ملکوں کے ساتھ دوستانہ و تجارتی تعلقات سے ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک کی تمام ترقی پسند و بائیں بازو کی قوتوں کے درمیان اتحاد سے بنیادی سماجی تبدیلی کے لئے جدوجہد کو منظم کیا جائے۔ کیونکہ اس بنیادی تبدیلی اور اقتدار محنت کشوں کے ہاتھ میں آنے سے ہی کرپشن کا خاتمہ ہوگا اور حقیقی جمہوری ادارے مضبوط ہونگے۔

☆☆☆

کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں
بہت کم ظرف تھا جو محفلوں کو کر گیا ویران
نا پوچھو حال یاراں شام کو جب سائے ڈھلتے ہیں
وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں
کہاں تک دوستوں کی بیدلی کا ہم کریں ماتم
چلو اس بار بھی ہم ہی سر مقتل نکلتے ہیں

حبیب جالب

پانامہ لیکس کو کیوں سامنے لایا گیا

کیا جرمنی کا فاضل کرنٹ اکاؤنٹ عالمی معیشت کیلئے خطرناک ہے؟

نجم الحسن عطا

1980 میں جب ریگن اور تھیچر نے سرمایہ داری ترقی کو ایک نیا نسخہ اور فارمولا تھمایا تو اس میں آزاد تجارت کو بڑی اہمیت دی گئی اور اب امریکا بھی آزاد تجارت کو اپنے لئے نقصان دہ سمجھتا ہے۔ نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ قرض دار ملک امریکا ہے اور آزاد تجارت کی وجہ سے ایک دو ملکوں کو چھوڑ کر جس میں جرمنی شامل ہے، سب کے سب قرض دار کیوں اور ان کو قرضہ دینے والا کون ہے؟ اسے سمجھنے کیلئے ایکسپورٹ ماڈل کو سمجھنے کی ضرورت ہے، جس کیلئے تمام سرحدیں تجارت کیلئے کھلی چھوڑنے کی شرط رکھی گئی اور کسٹم ڈیوٹی صفر رکھنے کو کہا گیا۔ شروع شروع میں اس سے ٹیکنالوجیکل ترقی یافتہ ملک فائدے میں رہے، خاص طور پر چین اور جرمنی دونوں کا تجارتی توازن فاضل رہا۔ رواں سال جرمنی کا توازن ادائیگی 300 ارب ڈالر اور چین 200 ارب ڈالر سے فاضل ہے۔ فاضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دونوں ممالک کی برآمدات بہت زیادہ اور اس کے مقابلے میں درآمدات بہت کم ہیں۔ درآمدات کم کے معنی یہ ہوئے کہ جرمنی اور چین کے لوگ بیرونی اشیاء مصنوعات کو کم استعمال کرتے ہیں، جسے امریکا اپنے لئے نقصان دہ سمجھتا ہے۔ دوسری یہ بات بھی ہوسکتی ہے کہ دونوں ممالک کے لوگ بچت میں اضافہ اور تصرف کم کررہے ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں کنزیومرازم کم ہوجائے یا سرد بازاری کا شکار ہوجائے تو انڈسٹری اور کاروبار ٹھپ ہوسکتا ہے، پھر اگر منافع بہت کم ہو تو لوگوں کو بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آئے دن سرمایہ داری نظام نئے نئے بحرانوں میں مبتلا رہتا ہے، جس کا نقصان دنیا کے عوام اٹھاتے ہیں۔ ملٹی نیشنلز کمپنیاں 85 فیصد عالمی تجارت میں حصہ رکھتی ہیں۔ آزاد تجارت ان کے حق میں رہتی ہے۔ سرحدیں کھلی چھوڑنے اور قرضوں میں جکڑنے کے بعد ریاستوں پر ملٹی نیشنلز کمپنیاں اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ آج کی عالمی معیشت کا یہی خلاصہ ہے، اس کے نرغے میں تیسری دنیا خساروں کا سامنا کررہی ہے۔ توازن ادائیگیوں میں خسارے، کرنسیوں کی قدر میں مدوجزر آزاد تجارت کیلئے نقصان دہ نتیجہ ہے۔ 1980 میں جب ریگن تھیچر کا گلوبلائزیشن کے بھیس میں آزاد تجارت کا آغاز ہوا تھا تو ترقی یافتہ ملکوں کی برآمدات میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا لیکن رفتہ رفتہ سخت مقابلے نے ایسی صورتحال پیدا کردی کہ تمام ترقی یافتہ ممالک ہوس کی دوڑ میں آگے نکلنے لگے، پھر بینکوں نے بھی قرضے مختلف ممالک اور صارف کو دینے شروع کردیئے۔ کریڈٹ کارڈ کے کلچر نے کنزیومرازم کے رومانس کو بڑھا دیا۔ لیزنگ پر تیسری دنیا میں گاڑیوں کی قطاریں لگ گئیں، امریکا نے بینکوں کے ذریعے تمام حدیں پھلانگ کر گھروں کیلئے قرضے دینے شروع کردیئے۔ کیسینوز میں عالمی سطح پر جوئے نے تیزی پکڑی۔ سروسز انڈسٹری نے انڈسٹرلائزیشن کو پیچھے چھوڑ دیا۔ انفرااسٹرکچر بنانے کے بجائے اسٹاک مارکیٹوں میں سٹہ بازی عروج پر پہنچ گئی۔ اسمارٹ منیجروں نے مائیکرو سطح پر تصرف (Spending) بڑھانے کیلئے کریڈٹ کارڈ تاش کے پتوں کی طرح تقسیم کیئے۔ دنیا میں سیلولر گیر جٹس ہر آدمی کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے۔ غیر پیداواری سرمایہ کاری، سٹہ بازی اور سود کو تقویت مل گئی اور فنانشلائزیشن یعنی روپے کے عوض روپیہ کمانے والے دھندوں کو فروغ ملا۔ آف شور کمپنیاں عام ہوئیں، ملکوں ملکوں ٹیکس چوری نے حکومتوں کے ریونیو کو کم کردیا۔ آزاد تجارت نے قرضوں کو بڑھایا۔ چین نے سستی مصنوعات بنا کر امریکا سمیت بہت سے ملکوں کی انڈسٹری کو ٹھپ کردیا۔ اسی دوران ہوس کے نتیجے میں زائد پیداوار نے لوگوں کی قوت خرید کم کردی۔ کریڈٹ کارڈ کے بارے میں ایک امریکی نوجوان نے کہا کہ اس نے 35 سال میں اگلے 35 سال کی شاپنگ کرلی۔ اب اس کی تنخواہ کا 80 فیصد حصہ کریڈٹ کارڈ کے سود میں جارہا ہے۔ زائد پیداوار سے رسد زیادہ ہوئی، طلب کم ہوئی، اسی دوران ہوس اور لالچ کے نتیجے میں عالمی مالیاتی انہدام ہوگیا اور مغرب بحران میں مبتلا ہوگیا۔ آزاد تجارت کے بارے میں ابتداء میں دلیل دی جاتی تھی کہ اس سے ملازمتوں کے مواقع پیدا ہوں گے، خوش حالی آئے گی اور قوموں کے مابین تعاون بڑھے گا۔ حقائق کے برعکس تجریدی مقاصد کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ تیسری دنیا کے قرضے بڑھے تو کارپوریٹ پاور میں اضافہ ہوا۔ اسمگلنگ اور ٹیکس چوری دنیا بھر میں تیزی سے بڑھنے لگی، اسی وجہ سے آف شور کمپنیوں کی حوصلہ شکنی کرنے کیلئے پانامہ لیکس کو سامنے لایا گیا۔ یورپین یونین بمقابلہ امریکا کے درمیان تجارتی سرد جنگ چل ہی رہی تھی، لیکن چین نے جب تجارتی یلغار کردی تو ترقی یافتہ ملکوں میں بھونچال آگیا۔ بڑے سرمایہ داروں اور برانڈوں نے منافع کیلئے چین میں سرمایہ کاری کی برانڈ سستے بننے لگے اور زیادہ قیمتوں پر فروخت کیئے گئے۔ چین کی شرح نمو 9 فیصد تک پہنچ گئی۔ ایشیائی اور عالمی مالیاتی بحران کے بعد یہ چرچا بھی ہوا کہ ایک بین الاقوامی ''باڈی'' بنائی جائے، جو سرمائے کے بہاؤ پر نظر رکھے۔ جارج سروس نے کہا کہ آئی ایم ایف کو یہ ''پاورز'' دی جائیں، لیکن آئی ایم ایف نے مؤقف اختیار کیا کہ سرمائے کو کھلی اجازت ہو، وہ جہاں چاہے اپنی کرنسی کو پارک کرے۔ گلوبل کیپٹل میں گڑبڑ

کرنے میں بینکوں کا بنیادی کردار سامنے آیا۔ آئی ایم ایف کی ہدایت تھی کوئی، ایک ملک سرمائے کی آمدورفت کو روک نہیں سکتا، اس میں منی لانڈرنگ کا کاروبار زیادہ تھا، وہ دنیا کے غیر قانونی کاروبار اور دہشت گردی کے کام میں لایا جانے لگا۔ 11/9 نے اس امر کی تصدیق کر دی کہ دنیا کی دو نمبری اور ٹیکس چوری نے غیر قانونی عناصر کو ایسے مواقع فراہم کیئے کہ ہر ملک میں اسلحہ کی فروخت، جوئے، دو نمبری اور اسمگلنگ کو خوب فروغ ملا، جس کے نتیجے میں دنیا کے عام لوگوں کی سلامتی اور قوت خرید دونوں خطرے میں پڑ گئیں، پھر عالمی طاقتوں نے منی لانڈرنگ اور سفری آمدورفت پر پابندیاں لگانی شروع کر دیں۔
آزاد تجارت امریکا کیلئے زہر قاتل، جبکہ جرمنی اور چین کیلئے شریں فرد ابن گئی۔ ڈالر کی موت پر کتاب لکھی گئی، امریکا قرض دار ہو گیا۔ چین کے پاس زرمبادلہ ذخائر تین ہزار ارب ڈالر تک پہنچ گئے، چنانچہ اس نے راہداریوں کی صورت افریقا، ایشیاء اور مشرق وسطی کے کئی ممالک میں سرمایہ کاری شروع کر دی، اسے یہ بھی خدشہ رہا کہ امریکا پروٹیکشنزم کی پالیسی اپنا کر چین کی برآمدی یلغار کو روکے گا، چنانچہ چین نے اپنے مفاد کیلئے سرمایہ کاری شروع کر دی، جو قرضوں کی صورت میں ہو رہی ہے اور خام مال بھی چین سے خریدنے کی شرط رکھی ہے۔ پاکستان کیلئے سلامتی سمیت سی پیک کتنا مفید یا کتنا نقصان دہ ہے، اس پر مباحثے ہونے چاہئیں، کیونکہ امریکا ایک عرصے سے ایشیاء میں جنگ چاہتا ہے۔ مشرق وسطی کو اس نے برباد کر دیا اور اب وہ سی پیک پر یلغار کرنا چاہتا ہے۔ ایک طرف ایشیاء میں چین اور روس کے مفادات ہیں، دوسری طرف افغانستان، ایران اور ہندوستان کے مفادات کو امریکا اپنے مفادات کی آڑ میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہوس اور سرمایہ داری کا کھیل ہے۔ پہلے ہی پاکستان، افغان وار کے امریکی کھیل میں برباد ہو چکا اور اب درمیان میں کھڑا جان بچانے کی سوچ رہا ہے۔

براں بریں مالیاتی و انتظامی انارکی نے دہشت گردی سے مل کر پاکستان کو عدم استحکام کی طرف دھکیل دیا ہے، ہر طرف لوگ اپنے اپنے راگ الاپ رہے اور تبصرے پر تبصرے کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہیں، اپنی جہالت کے سایوں پر کود رہے ہیں اور اندھیرے کمرے میں نحوست ماری کالی بلی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اور دو پانچ کہنے والی لیڈر شپ لوٹ مار بچانے اور سامراج سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بائیں بازو، جو صرف بائیں انگلی رہ گئی، ایک دوسرے کی نہیں سنتے۔ عوام کب ان کو سن پائیں گے، حالانکہ سچ انہی کے پاس ہے، لیکن لوگ سچ سننے کے عادی نہیں ہیں۔

گذشتہ ہفتے اکنامسٹ کے سرورق کی کہانی کا عنوان ان سارے جھمیلوں کے دوران سامنے آیا۔ تحریر میں درج ہے کہ جرمنی کی فاضل تجارت دنیا کیلئے خطرناک ہے اور امریکا اس کی شدید مخالفت کر رہا ہے، کیونکہ گلابلائزیشن اسے راس نہیں آئی۔ اس لئے وہ ایشیاء میں عالمی جنگ چاہتا ہے۔ مارکس نے فنانشلائزیشن کے پجاریوں کے بارے میں 200 سال پہلے کتنی خوبصورت بات کہی تھی کہ ''پیسہ زمانے کے سارے دیوتاؤں کو سر بازار نیلامی کی اشیاء بنا دیتا ہے، اس نے خود کو ہر چیز کی آفاقی قدر بنا ڈالا ہے، یوں پیسے نے انسان اور فطرت کی دنیا سے اس کی حقیقی قدر چھین لی۔ پیسہ انسان کی محنت اور اس کے وجود کی بیگانگی کی اساس ہے، یہ بیگانگی انسان کے وجود پر مسلط ہو کر اسے پیسے کی پوجا پر مجبور کرتی ہے''۔

یہ بھی کارل مارکس نے کہا تھا کہ ''شخصی آزادی اجتماعی آزادی کے بغیر ممکن نہیں'' اور پاکستان کی لیڈر شپ نے اجتماعی آزادی کو لوٹ مار اور بیرونی قرضوں کے آگے گروی رکھ دیا ہے۔ (ہم کیا سوچیں، کیا لکھیں، شام ڈھلنے پر فکر فردا نڈھال کر دیتی ہے) اب تو عالمی سطح پر سرمایہ داری نظام زوال پذیر ہے، اس کی وجہ سے بھی پاکستان پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں، لیکن پاکستان میں کوئی مہاتیر محمد بھی نہیں، جو ملک کے بارے میں سوچے، ادھر اکنامسٹ لندن لکھتا ہے کہ ''تجارتی صف آرائی ہو گئی ہے، جنگ کیلئے تیاری مکمل'' جی 20 کی ہمبرگ میں جو سمٹ ہوئی تھی، اس میں امریکا جو پروٹیکشنزم کا حامی ہے اور دوسری جانب آزاد تجارت کا حامی جرمنی، دونوں کی ایک دوسرے سے جھڑپیں ہوئیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ پہلے ہی تجارتی معاہدے سے الگ ہو چکا ہے۔ امریکا ٹرانس پیسفک معاہدے میں پارٹنر تھا، اسے منسوخ کر کے نیا معاہدہ چاہتا ہے۔ دنیا کا 50 فیصد فولاد چین نہایت کم لاگت پر پیدا کرتا ہے۔ امریکا اس بات پر غور کر رہا ہے کہ وہ اسٹیل کی درآمد پر بلند شرح پر کسٹم ڈیوٹی عائد کرے، تاکہ امریکی فولاد کی فروخت ہو، اگر فولاد کی درآمدات پر امریکا نے پابندی عائد کر دی تو یہ عالمی تجارتی تنظیم اور آزاد تجارت کا خاتمہ تصور کیا جائے گا۔ تجارتی جنگ کا آغاز اسی دن ہو گیا تھا، جب ٹرمپ نے حلف اٹھانے کے بعد گلوبلائزیشن پر تنقید کی۔ سمٹ میں جرمنی کی چانسلر انجیلا مرگل نے آزاد تجارت کے حق میں دھواں دھار تقریر کی۔ چانسلر نے ٹرمپ پر تنقید کی اور کہا کہ ''پروٹیکشنزم کے حامی دنیا میں تنہا ہو جائیں گے''۔ جب انجیلا مارکل امریکا کی مذمت کر رہی تھیں، اسی دن جاپان اور یورپین یونین کے درمیان آزاد تجارت کے تحت ایک معاہدہ ہوا۔ جی 20 کی سمٹ میں یہ سوال نہیں تھا کہ کس طرف سے اچھے دلائل دنیا کے سامنے آئے۔

صدر ٹرمپ کی ڈاکٹرین یہ تھی کہ عالمی تجارت متوازن ہونی چاہیے۔ تاریخ گواہ ہے کہ غریب دنیا کو چبا جانے والے سامراجی آج عالمی تجارت میں توازن کی بات کر رہے ہیں۔ ٹرمپ کے ہاتھ میں ایک بھونڈا سوال یہ تھا کہ جرمنی کا تجارتی توازن فاضل کیوں ہے؟ 300 ارب ڈالر جرمنی کا توازن ادائیگیوں میں سرپلس ہے اور چین کا 200 ارب ڈالر ہے۔ جب امریکا ایک زمانے میں پیش پیش تھا، اس وقت سب ہی خاموش تھے، ٹرمپ نے دھمکی دی کہ وہ جرمن کاروں پر پابندی لگا دے گا۔ جرمنی نے جواب دیا کہ یہ شکست خوردہ ذہنیت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی یہ بھی کہتے ہیں کہ جرمنی بچت زیادہ کرتا ہے اور خرچ کم کرتا ہے؟ آپ دیکھئے کہ جرمنی دنیا کا ترقی یافتہ ملک ہے، پہلے دو تین ملکوں میں شمار ہوتا ہے لیکن پاکستان جرمنی کے برعکس، بچت نہ ہونے کے برابر کرتا ہے اور خرچ حد سے زیادہ کرتا ہے اور قرضوں پر انحصار کرتا ہے۔ نتیجتاً عالمی تجارتی جنگ میں پاکستان برآمدات میں شدید نقصان اٹھا رہا ہے۔ دنیا میں بہت زیادہ بچت کرنا بھی ذخیرہ اندوزی کے برابر سمجھی جاتی ہے، کیونکہ سرمایہ داری نظام ٹیکسوں کے حصول اور خرچ کرنے پر چلتا ہے۔ جرمنی کا سرپلس اس کی بچت سے زیادہ ہو گیا ہے، بچتوں کو سرمایہ کاری پر نہیں لگایا جا رہا، بلکہ سرپلس کو اس کام کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

ان کی نصاب کی کتابوں میں ایک فارمولا دیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ بچت، سرمایہ کاری کے، اب ان کتابوں کے برعکس ہوا اور ایک دوسرے کی کرنسیوں کی قدر گھٹانے کی جنگ سے تجارتی برآمداتی جنگ کے ذریعے ایک دوسرے کو شکست دینے کا کھیل کھیلا جا رہا ہے، اس کھیل میں سرمایہ دار کلب اور ملٹی نیشنلز فائدہ اٹھا رہے ہیں، جبکہ ریاستیں ٹیکس چوری، بہت زیادہ منافع کی وجہ سے خسارے میں جا رہی ہیں۔ اس لئے پاناما لیکس اور پروٹیکشنزم کی پالیسیوں پر امریکا زور دے رہا ہے۔

الجزیرہ

آزاد میڈیا اور سعودی بحران

ڈاکٹر توصیف احمد خان

الجزیرہ عرب دنیا کا آزاد ٹی وی چینل ہے جس کی نشریات عربی اور انگریزی میں ہوتی ہے، الجزیرہ کی نشریات دیکھنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے، اس کی عربی کی نشریات مشرق وسطیٰ میں دیکھی جاتی ہے اور الجزیرہ کے انگریزی زبان کے چینل دیکھنے والے پاکستان، افغانستان، ایران، بھارت، وسطیٰ اشیائی ممالک، چین، یورپ اور امریکہ میں بھی موجود ہیں۔ الجزیرہ قطر کے شاہی خاندان نے قائم کیا تھا، یوں تو قطر میں ایک مطلق العنان بادشاہت موجود ہے مگر قطر کے حکمرانوں نے ایک آزاد ٹی وی چینل قائم کرکے اپنے پڑوسی امارات کو مشکل میں ڈال دیا ہے، برطانیہ کے صحافی ہگ ملز نے الجزیرہ کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس کا نام انہوں نے Channel that is challenging the west inside story of the arab news رکھا۔ ہگ ملز کا کہنا ہے کہ الجزیرہ کے ناظرین کی تعداد 50 ملین سے زیادہ ہے۔ الجزیرہ کے قیام کا پس منظر کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ گذشتہ صدی کی 90 کی دھائی کے ابتداء میں سعودی عرب کے شاہ فہد کے ایک قریبی رشتہ دار نے بی بی سی کے اشتراک سے ایک چینل قائم کرنے کے کمپنی ORBIT کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کمپنی کا مقصد بی بی سی کی اردو کی نشریات تو عرصہ دراز سے دیکھی جاتی تھیں مگر اس علاقے میں انگریزی سمجھنے والے افراد کی تعداد کم تھی، یوں عربی زبان کی نشریات کا معاملہ مختلف تھا۔ بی بی سی کے حکام نے یہ شرط رکھی کہ عربی چینل کی پالیسی وہی ہوگی جو بی بی سی انگریزی چینل کی ہے، یوں 22 مارچ 1994ء کو بی بی سی اور اوربیٹ میں 10 سالہ نشریات کا معاہدہ ہوا، مگر کچھ برسوں بعد اوربیٹ کمپنی کو بی بی سی کی نشریات پر اعتراضات پیدا ہوئے، بی بی سی اور کمپنی کے درمیان معاہدہ ختم ہوگیا اور 20 ستمبر 1994ء کو یہ سروس بند ہوگئی، بی بی سی عربی سروس کے اچانک بند ہونے سے 250 پیشہ ور عربی صحافی بے روزگار ہوگئے۔ اس دوران الجزیرہ کے قیام کا خیال قطری حکمرانوں کے ذہن میں آیا اور بی بی سی سے فارغ ہونے والے 120 صحافی الجزیرہ میں شامل ہوگئے، پھر الجزیزہ کی انتظامیہ نے فلسطینی صحافیوں کو ترجیح دی۔ فلسطینی صحافیوں کے بارے میں تصور تھا کہ وہ زیادہ پڑھے لکھے ہیں اور بی بی سی سمیت میڈیا کے اداروں میں کام کرتے رہے ہیں، الجزیرہ کے منتظم مصطفیٰ کا کہنا ہے کہ الجزیرہ کے آپریشن اور بی بی سی کے آپریشن میں فرق تھا۔ الجزیرہ نے عربی صحافیوں کو بی بی سی اور دیگر بین الاقوامی میڈیا چینل کے معیار کے برابر اپنے مواد کو تیار کرنا تھا۔ الجزیرہ نے پہلے ایک عربی سیٹلائٹ کے ذریعے 6 گھنٹے کی نشریات کا آغاز کیا، پھر جنوری 1997ء میں نشریات کا دورانیہ 8 گھنٹے ہوا اور پھر 24 گھنٹے ہوگیا، نومبر 1997ء میں الجزیرہ اس پوزیشن میں آگیا کہ دنیا کے دیگر چینل سے مقابلہ کرسکے۔ عربی ممالک میں اب بھی خواندگی کی شرح کم اور غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزارنے والے افراد کی شرح زیادہ ہے۔ لوگوں کی قوت خرید بھی کم ہے تو اس بناء پر اخبارات کی سرکولیشن کم ہے۔ عرب ممالک میں الجزیرہ کی نشریات دیکھنے کے لیے کوئی فیس نہیں ہے، صرف سیٹلائٹ ڈش کی ضرورت ہے، جس کی قیمت 100 ڈالر سے 500 ڈالر تک ہوتی ہے۔ الجزیرہ اور دیگر بین الاقوامی چینلز میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ الجزیرہ کے انتظامی، ادارتی اور تکنیکی معاملات مکمل طور پر عربوں کے پاس ہیں اور الجزیرہ کے لیے ساری سرمایہ کاری بھی قطر نے کی ہے، یوں الجزیرہ بظاہر غیر عربیوں کا کوئی اثر نہیں ہے، الجزیرہ کی خبروں کے علاوہ ٹاک شوز نے بھی خصوصی شہرت حاصل کی، ان کے موضوعات مذہب، سیاست، اقتصادیات، دہشت گردی اور خواتین وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں، الجزیرہ کے ٹاک شوز لندن اور دیگر شہروں سے پیش کیے جاتے ہیں، یوں مختلف پس منظر رکھنے والے ماہرین کے خیالات ناظرین کو سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں، مجموعی طور پر ان ٹاک شوز میں دو مہمان ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد خیالات رکھتے ہیں۔ الجزیرہ کا ایک ٹاک شو Opposite Direction بہت مقبول ہوا۔ ایک ٹاک شو میں تیونس کے ایک لبرل دانشور مصنوعی داڑھی لگا کر آئے تاکہ مذہبی انتہا پسند ان کی شناخت نہ کرسکیں مگر بدقسمتی سے بحث ومباحثہ کے دوران ان کی مصنوعی داڑھی ان کے چہرے سے علیحدہ ہوگئی۔ پھر آدمی کو ان پروگراموں میں ٹیلیفون کے ذریعے سوالات کی آزادی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اس طرح کے پروگرام انقلابی نوعیت کے ثابت ہوئے۔ ان پروگراموں میں کام کرنے والے سے پہلے یہ نہیں پوچھا گیا وہ کیا سوال کریں گے۔ نہ لائیو پروگرام میں کسی مواد کو سنسر کیا جاتا ہے۔ الجزیرہ کے ان پروگراموں کے خلاف عرب ممالک کی جانب سے سخت ردعمل سامنے آئے۔ Opposite Direction میں سابق صدر کرنل قذافی کے ایک مخالف نے انہیں ڈکٹیٹر قرار دیا تھا تو لیبیا نے قطر سے اپنا سفیر بلا لیا تھا، اسی طرح حماس کے ایک رہنما کے انٹرویو نشر ہونے پر فلسطینی اتھارٹی نے الزام لگایا کہ فلسطین اتھارٹی کا امیج خراب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اسی طرح تیونس، بحرین اور ایران کی حکومت ان پروگراموں سے ناراض ہوئی۔ شام کے صدر اسد نے الجزیرہ کو اسرائیل کا ایجنٹ قرار دے دیا۔ جب الجزیرہ نے صدر صدام کے دور میں اقوام متحدہ کی پابندیوں کی بناء پر عراق میں غذائی قلت پر ڈاکیومنٹری بنائی تو صدام کا خیال تھا کہ اس سے ان کے اقوام متحدہ کے خلاف مؤقف کو تقویت ملے گی مگر جب الجزیرہ نے صدام کی سالگرہ کی تقریبات کی کوریج کی تو وہ ناراض ہوگئے تھے۔ قطر کے وزیر خارجہ شیخ حماد بن جاسم جو الجزیرہ کے ایک بڑے حصص کے حصہ دار ہیں کہتے ہیں کہ جب بھی انہیں چینل کی کسی خبر یا ٹاک شو کے بارے میں شکایت ملی تو چونکہ الجزیرہ اپنی ادارتی پالیسی میں مکمل طور پر خود مختار ہے اس لیے وہ ان شکایات کو داخل دفتر کردیتے ہیں۔ الجزیرہ والے کہتے ہیں کہ اگرچہ کی چینل کی فنڈنگ قطر کی حکومت کرتی ہے مگر یہ اسی طرح کرتی ہے جیسے برطانیہ کی

حکومت بی بی سی کی کرتی ہے مگر بی بی سی کی طرح الجزیرہ اپنی انتظامی اور ادارتی پالیسی بنانے اور عملدرآمد کرنے میں آزاد ہے۔ الجزیرہ نے یکم فروری 1999ء کو تین مختلف چینلز سے 24 گھنٹے نشریات شروع کی ہے۔ اس کے ملازمین کی تعداد 500 تک پہنچ گئی تھی اور عرب ممالک کے علاوہ روس اور امریکہ میں بھی اس کے بیورو قائم ہوئے۔ پھر ایرانی ٹی وی چینل سے تہران میں بیورو کھولنے کا معاہدہ ہوا اسی زمانے میں چینل نے اسرائیلی کیبل کمپنی سے معاہدہ کیا۔ ان انگریزی کے ڈیجیٹل چینل ایک ڈاکیومنٹری کے چینل کے ساتھ اسرائیل میں آباد عربوں کے لیے علیحدہ چینل شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ طالبان 2000ء میں الجزیرہ اور سی این این کو پیشکش کی تھی کہ وہ کابل میں اپنے بیورو قائم کریں۔ سی این این نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا مگر الجزیرہ نے کابل میں بیورو قائم کرنے کا فیصلہ کیا، یوں افغانستان کی صورتحال کو الجزیرہ نے بہتر انداز میں کور کیا۔ اکتوبر 2000ء میں فلسطین میں دوسری شروع ہوئی۔ مقبوضہ عرب علاقوں میں فلسطینیوں نے اسرائیل کے اقتدار کو چیلنج کیا۔ انتفادہ کے واقعات کی کوریج کے اسرائیل، مقبوضہ فلسطین اور مشرقِ وسطیٰ میں مختلف نتائج برآمد ہوئے۔ 2003ء میں راملہ میں الجزیرہ کے بیورو چیف و لیدال عمری نے دنیا کا سب سے خطرناک کام انجام دیا۔ انہوں نے اسرائیلی فوج کے ہاتھوں مرنے والے ہزاروں فلسطینیوں کی لاشوں کو دکھایا اور دنیا کو حقیقی صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس زمانے میں مغربی ٹیلی وژن چینلوں نے الجزیرہ کی کوریج کا نوٹس لیا اور بین الاقوامی میڈیا روزانہ دریائے اردن کے مغربی کنارے کی خبروں کے لیے الجزیرہ پر انحصار کرنے لگا۔ امریکی وزارت خارجہ نے الجزیرہ کی کوریج کا خیر مقدم کیا۔ امریکی حکومت نے الجزیرہ سے رابطہ کیا اور خواہش کا اظہار کیا کہ وائس آف امریکہ کی نشریات کو الجزیرہ ہی ٹیلی کاسٹ کرے مگر الجزیرہ کی انتظامیہ نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ اسرائیلی حکومت نے مغربی رپورٹروں کو بریف کرنا شروع کیا کہ الجزیرہ فلسطینیوں کی تحریک کے بارے میں حقائق مسخ کر رہا ہے۔ الجزیرہ کی انتظامیہ نے اس بات سے انکار نہیں کیا کہ فلسطینی نوجوانوں کی تحریک کی فوٹیج سے فلسطینی کاز کو تقویت ملی ہے۔ الجزیرہ نے اس الزام سے انکار نہیں کیا بلکہ کہا کہ یہ سب کچھ فطری طور پر ہو رہا ہے کیونکہ حقائق پیش کرنے کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی خبریں شائع ہوئیں کہ اسرائیلی وزیراعظم اور وزیر خارجہ کسی دوسری عرب چینل کے مقابلے میں الجزیرہ کو مسلسل دیکھتے ہیں۔ 2001ء میں اسرائیل کے وزیراعظم نے الجزیرہ کو ایک طویل انٹرویو دیا۔ اسرائیلی وزیراعظم نے انٹرویو میں انتفادہ کے بارے میں سوالات کے جوابات دیئے۔ انہوں نے پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات سے اپیل کی کہ وہ فلسطینی میں علاقے میں تشدد کو رکوائیں۔ الجزیرہ نے فلسطین اور اسرائیل میں اس انٹرویو پر انعامات حاصل کیئے مگر اسرائیلی وزیراعظم انتخابات میں شکست کھا گئے۔ اسرائیل کی نئی حکومت نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ الجزیرہ کی نشریات کی بناء پر انہیں میڈیا وار میں شکست ہوئی، اس بناء پر اسرائیلی حکومت نے ایک انگریزی اور عربی کے چینل کے لیے فنڈ فراہم کیے تاکہ الجزیرہ کا جواب دیا جا سکے۔ اس زمانے میں فلسطینی اتھارٹی اور یاسر عرفات الجزیرہ کا جواب دیا جا سکے۔ اس زمانے میں فلسطینی اتھارٹی اور یاسر عرفات الجزیرہ کی کوریج سے ناراض ہوئے۔ یاسر عرفات کو شکایت تھی کہ اس چینل نے ایک ڈاکیومنٹری میں یاسر عرفات کی زندگی کے بارے میں امیج کو بگاڑا ہے۔ پھر فلسطینی اتھارٹی نے الجزیرہ پر پابندی لگا دی اور الجزیرہ کے رپورٹرز کی آمدورفت محدود کر دی۔ نائن الیون کی دہشت گردی کے واقعے کے بعد الجزیرہ کے نیویارک بیورو کو ایک فیکس موصول ہوا۔ شیخ اسامہ بن لادن کے دستخط سے جاری ہونے والے فیکس میں نائن الیون کی دہشت گردی کے واقعے میں ملوث ہونے سے انکار کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ انفرادی کارروائی ہے۔ بیان میں کہا گیا کہ وہ افغانستان میں ہیں مگر وہ طالبان کے قانون کے پابند ہیں۔ امریکہ نے اس تردید کو مسترد کر دیا تھا۔ اسامہ نے کئی دفعہ الجزیرہ کو بیان جاری کیے۔ ان بیانات میں انہوں نے امریکہ کی عراق میں پیش قدمی پر سخت کارروائی کی دھمکی دی تھی۔ مغربی میڈیا نے الجزیرہ کے اسامہ کی فوٹیج کو مسلسل استعمال کیا۔ الجزیرہ نے افغانستان میں اتحادی فوج کے حملے اور طالبان حکومت کے خاتمے کے واقعات کو براہ راست کور کیا جس سے امریکہ اور الجزیرہ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ کابل میں الجزیرہ کے دفتر کے قریب 227 کلوگرام کے دو امریکی بم پھٹے۔ دفتر میں کوئی موجود نہیں تھا، یوں جانی نقصان نہیں ہوا۔ عراق جنگ کے دوران بھی ایسا ہی ہوا۔ عراق جنگ میں الجزیرہ کے کئی رپورٹر جو عراق کے شہروں میں کام کر رہے تھے زخمی ہوئے۔ پھر امریکی انتظامیہ نے قطر کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ الجزیرہ کو بند کیا جائے۔ الجزیرہ نے مصر، لیبیا، شام، یمن اور باقی عرب دنیا کے واقعات کو بھی اسی طرح کور کیا جس سے حقائق ظاہر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ الجزیرہ عرب حکومتوں کے لیے ایک خطرہ بن گیا۔ مگر الجزیرہ کو بند کرنے کا مطلب عوام کے کانوں اور آنکھوں کو بند کرنا ہے مگر نئی ٹیکنالوجی کے دور میں یہ ممکن نہیں ہے۔ الجزیرہ سے سب سے زیادہ خطرہ ال سعودی ریاست کو ہے۔ سعودی مملکت زوال کی طرف گامزن ہے ایک طرف تیل کا متبادل مادہ بین الاقوامی مارکٹ میں آ گیا ہے اور امریکہ کے پاس تیل اور اس کے بنیادی مادہ کے ذخائر دستیاب ہیں۔ یوں اب امریکہ کا سعودی عرب کی دولت پر انحصار نہیں رہا تو دوسری طرف سعودی عرب میں ال سعود کے خلاف مختلف گروہوں کی مزاحمت میں شدت آ گئی ہے۔ اس مملکت کی آبادی کی اکثریت کا تعلق شیعہ فرقے سے ہے۔ ال سعود نے اس اکثریتی آبادی کو محدود کیا ہوا ہے اور ان کے کوئی انسانی حقوق نہیں ہیں۔ ایران کی مدد سے شیعہ نوجوان اب زیادہ شدت سے مزاحمت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف سلفی انتہا پسند جو اسامہ بن لادن کے پیروکار ہیں خودکش دھماکہ کر کے مملکت کی رٹ کو پامال کرتے ہیں، پھر تعلیم کی شرح بڑھنے سے متوسط طبقہ خاص طور پر خواتین اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھاتی ہیں۔ سعودی حکومت خواتین کو چند معمولی حقوق دینے پر تیار ہوئی ہے تو رجعت پسند ملا مخالفت کرتے ہیں۔ پھر شاہی خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ موجودہ بادشاہ نے اپنے خاندان کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کے بیٹے کو ولی عہد سے معزول کر دیا اور بیٹے کو ولی عہد بنا دیا۔ سعودی عرب کے امور پر توجہ دینے والے ایک صحافی نے تو یہ خبر تحریر کی کہ سابقہ ولی عہد کو نظر بند کر دیا گیا ہے، یوں سعودی حکمراں اپنے ملک میں اخبارات اور الیکٹرونک میڈیا کو آزادی دینے کو تیار نہیں۔ اس حکومت نے سوشل میڈیا پر بھی پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں مگر الجزیرہ کا عربی چینل ال سعود کی بدترین آمرانہ حکومت کو کمزور کر رہا ہے۔ سعودی عرب کی ایماء پر دیگر عرب ممالک بھی الجزیرہ سے خوفزدہ ہیں۔ 1959 میں ایوب خان کی حکومت نے پی پی ایل کے اخبارات پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور ہفت روزہ لیل ونہار پر پابندی امریکہ کی ایماء پر لگائی تھی جس کا سارا نقصان پاکستان کے عوام کو ہوا۔ الجزیرہ جیسے چینل ہر مسلمان ملک میں قائم ہونے چاہئیں جبھی حقیقی تبدیلی رونما ہوگی۔

برطانوی انتخابات اور لیبر پارٹی

نیولبرل سامراجی ایجنڈے کی مزاحمت

ریاض احمد شیخ

۸ جون کو برطانیہ میں منعقد کئے جانے والے انتخابات نے لیبر پارٹی کی بہتر کارکردگی پر بیشتر دنیا کو حیران کر کے رکھدیا، دائیں بازو کی ٹوری پارٹی سے تعلق رکھنے والی وزیراعظم تھریسامے نے اس امید پر ان انتخابات کا اعلان کیا تھا کہ وہ ان انتخابات کے زریعے زیادہ اکثریت حاصل کر کے یورپی یونین سے علیحدگی کے عمل میں زیادہ بااختیار ہوکر بات چیت کرسکیں گی، لیکن نتائج اس کے بالکل برعکس نکلے اور وہ اپنی گزشتہ نشستوں سے بھی کم نشستیں حاصل کرسکیں اور اس کے مقابلے میں لیبر پارٹی نے اپنی گزشتہ کارکردگی سے کہیں زیادہ بہتری کا مظاہرہ کیا اور اپنی نشستوں میں ۳۰ نشستوں کا اضافہ کیا اور ایک مرحلے پر یہ بات بھی کی گئی کہ وزیراعظم کو اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت سے علیحدہ ہوجانا چاہئیے اور لیبر پارٹی کو یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ حکومت سازی کرے لیکن دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی وزیراعظم تھریسامے نے دیگر پارٹیوں سے ملکر مخلوط حکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ لیبر پارٹی کی یہ بہتر کارکردگی اس صورتحال میں سامنے آئی جبکہ عمومی طور پر پارٹی کے سربراہ جریمی کاربین کی قائدانہ صلاحیتوں پر شدید تحفظات کا اظہار کیا جارہا تھا اور ان سے مستعفی ہوکر کسی دوسرے مقبول اور کم عمر رہنماء کو پارٹی قیادت سونپنے کا مشورہ دیا جارہا تھا اور لیبر پارٹی کے پارلیمانی گروپ میں جریمی کے مخالفین کا ایک بڑا مضبوط گروہ موجود تھا لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود لیبر پارٹی نے انتخابات میں اپنی پارٹی پوزیشن بہتر کی اور جریمی نے عوامی رابطہ کاری کے زریعے لیبر پارٹی کو بڑے قلیل عرصے میں ایک بار پھر برطانیہ کی مقبول عوامی پارٹی کے طور پر پیش کیا لیکن اس مرحلے پر یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ آخر جریمی نے ایسا کیا کیا کہ انتخابات سے چند ماہ قبل جس پارٹی اور اسکی قیادت پر اس قدر بداعتمادی کا مظاہرہ کیا جارہا تھا اس نے ان تمام خدشات اور کچھ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کی رائے کو غلط ثابت کردیا، اس چھوٹے سے مضمون میں اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

برطانیہ کے اقتصادی نظام میں ایک بڑی تبدیلی ۱۹۷۹ میں اس وقت آئی جب ٹوری پارٹی سے تعلق رکھنے والی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر نے فلاحی معاشی نظام کو لپیٹتے ہوئے نیو لبرل اقتصادی نظام کی طرف تیزی سے قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا، کھلی منڈی، نجکاری، نئے معاشی نظام کی اساس قرار دئے گئے امریکی صدر ریگن نے برطانیہ کے اس اقدام کی بھرپور تائید کی۔ بعدازاں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد بقیہ فلاحی اقدامات کے خاتمے کی طرف بڑی تیزی دیکھنے کو ملی اس دوران برطانیہ نے امریکہ کا حلیف بنتے ہوئے، امریکہ کی طرف سے شروع کی گئی تقریباً تمام جنگوں میں بھرپور ساتھ دیا اس کے نتیجے میں بتدریج برطانیہ کے اقتصادی مسائل میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے برطانوی حکومت کو کئی ایسے ٹیکس عائد کرنے پڑے جس سے عام آدمی براہ راست متاثر ہوا، اسی طرح کئی فلاحی پالیسیوں کا بھی خاتمہ کرنا پڑا جس کے نتیجے میں برطانیہ میں حکومت کے ان اقدامات کے خلاف آوازیں سامنے آنے لگیں، ان مسائل کو حل کرنے اور اپنی خارجہ پالیسی کو امریکہ کے اثر سے نکالنے کی بجائے ٹوری پارٹی نے ان مسائل کا ذمہ دار برطانیہ کے یورپی یونین میں رہنے کو قرار دیتے ہوئے برطانیہ کے یورپی یونین سے باہر نکلنے پر زور دیا اور بالآخر گزشتہ برس کے ریفرنڈم میں یورپی یونین سے علیحدگی کے حق میں ووٹ حاصل کرنے کے بعد وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون نے استعفیٰ دیدیا اور ان کی جگہ تھریسامے نے وزارت عظمیٰ سنبھال لی۔ جولائی ۲۰۱۶ میں وزیراعظم بننے کے باوجود وہ کوئی بڑا کام نہ کرسکیں جس کی بنیادی وجہ مکمل اکثریت کا نہ ہونی تھی اسی امید پر انہوں نے دوبارہ الیکشن کروائے کہ وہ اب بھاری اکثریت حاصل کرلیں گی ان کا خیال تھا کہ لیبر پارٹی اور خصوصاً اسکے لیڈر جریمی عوام میں اتنی مقبولیت نہیں رکھتے اس لئے وہ اس الیکشن میں بڑی بری طرح ہار جائیں گے لیکن لیبر پارٹی اور اسکی قیادت نے ان تمام خدشات کو یکسر ناکام بنادیا۔

لیبر پارٹی نے ان اچانک اعلان کئے گئے انتخابات کے اعلان کے باعث پریشان ہونے کی بجائے چند ہفتوں میں ایک ایسا انتخابی منشور تیار کرلیا جو کہ برطانیہ کے زمینی حقائق کی کھلی تصویر عوام کے سامنے لے آیا اور مستقبل کا ایک لائحہ عمل بھی دیدیا۔ اس انتخابی منشور نے عوام کو دائیں بازو کی ٹوری پارٹی کے عوام دشمن اقدامات کی تفصیلات بھی فراہم کیا اور اس کے مقابل اپنا عوام دوست ایجنڈا بھی دیا چنانچہ لیبر پارٹی کے اس عوام دوست نظریئے نے بھی پارٹی کو اس انتخابات میں بھرپور کامیابی دلائی۔

پارٹی نے اس انتخابی منشور کا نام "For the many , Not the few" [چند کی بجائے بہت سوں کے لئے] رکھا جس کا واضح مقصد ایک ایسا سیاسی اور اقتصادی نظام دینا تھا جس کا فائدہ اشرافیہ کے چند افراد کی بجائے ملک کے عوام کی اکثریت تک پہنچے، یقیناً یہ نام ہی عوام کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے کافی تھا اپنے انتخابی منشور میں پارٹی نے تمام امور مثلاً ٹیکس کے نظام، یورپی یونین سے علیحدگی، تعلیم، روزگار، سماجی تحفظ، رہائش کی فراہمی، صحت، امن و امان، کھیل، ثقافت، ماحولیات، ٹرانسپورٹ، میڈیا، خارجہ امور، اور معاشرے کے کمزور طبقات کے مسائل کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ انکے حل کے لئے ٹھوس لائحہ عمل بھی دیا، جگہ کی کمی کے باعث ان تمام امور پر تفصیلی بات تو نہیں کی جاسکتی لیکن صرف چند امور مثلاً تعلیم، صحت، روزگار جیسے موضوعات پر یہاں بات کی جائیگی۔

برطانیہ میں ۱۹۶۲ میں لیبر پارٹی کی حکومت نے مفت تعلیم فراہم کرنے کا قانون متعارف کرایا تھا جو کہ اگلی تین دہائیوں تک نافذالعمل رہا لیکن ۱۹۹۸ پہلی مرتبہ طلبہ کو حصول تعلیم کے لئے ٹیوشن فیس کی مد میں سالانہ بنیادوں پر ایک ہزار پونڈ ادا کرنا تھے، یقیناً طلبہ کو یہ فیس فوری طور پر ادا نہیں کرنی تھی بلکہ اس کے لئے حکومت نے ایک کمپنی قائم کی جو کہ طلبہ کی جگہ یہ ادائیگی

حکومت کو کرنے کی ذمہ دار تھی اور طلبہ اپنی تعلیم مکمل کرنے اور ملازمت کے حصول کے بعد یہ رقم قسطوں میں اس کمپنی کو واپس کرنے کے ذمہ دار تھے، بعدازاں ۲۰۰۴ میں یہ رقم بڑھا کر ۳۰۰۰ پونڈ کردی گئی اور ۲۰۱۰ میں ٹوری پارٹی نے یہ فیس تین گنا بڑھا کر ۹۰۰۰ پونڈ کردی اس طرح ایک طالبعلم اپنی تعلیم کے اختتام پر ۵۰۰۰ پونڈ سے زیادہ کا مقروض ہو چکا ہوتا ہے اور اپنی ملازمت کے آغاز سے لے کر کئی برس تک یہ قرم ادا کرتا رہتا ہے، لیبر پارٹی نے اپنے منشور میں اس بھاری فیس کے خاتمے کا اعلان کیا تھا اس کے باعث لیبر پارٹی کو سب سے زیادہ ووٹ نوجوانوں کی طرف سے پڑے، لیبر پارٹی نے نجکاری کے رجحان پر بھی شدید تنقید کی اور اپنے منشور میں یہ بات شامل کی کہ وہ اقتدار میں آ کر پرائیویٹائز کیئے گئے کئی یونٹس، مثلاً پوسٹ آفس کا نظام، ریلوے کا نظام دوبارہ سرکاری تحویل میں لے لیا جائے گا اسی طرح پینے کے پانی کا نظام جو نجی شعبے کے حوالے کیا گیا تھا اور ۲۰۱۵ میں اس کی مد میں ۲ بلین پاؤنڈ میں منافع کمایا تھا اس شعبے کو بھی واپس سرکاری تحویل میں لیا جائے گا اور عام آدمی پر لگائے جانے والے ٹیکس واپس کیئے جائیں گے، لیبر پارٹی نے اس بات کا بھی کھل کر اظہار کیا کہ برطانیہ میں جمہوریت ہونے کے باوجود فیصلے چندلوگ کر رہے ہیں، لیبر پارٹی اقتدار میں آ کر اس اشرافیائی نظام کا خاتمہ کرے گی لیبر پارٹی سمجھتی ہے کہ اب مزید نجکاری نہ کی جائے۔

لیبر پارٹی نے عام لوگوں کے لئے کم قیمت رہائش فراہم کرنے کا منصوبہ بھی اپنے منشور میں شامل کیا اور کہا کہ وہ ہر سال کم از کم ایک لاکھ فلیٹ تعمیر کر کے کم آمدنی والے لوگوں کو فراہم کرے گی، لیبر پارٹی کے مطابق ۲۰۱۰ سے برطانیہ میں کم آمدنی والے لوگوں کے لئے رہائش بڑا مسئلہ بن گئی ہے اور ۱۹۲۰ کے بعد پہلی مرتبہ دو لاکھ سے زائد خاندان گھر کی چھت سے محروم ہیں

لیبر پارٹی نے برطانیہ میں صنعتی عمل کے کمزور پڑنے کی طرف بھی توجہ دلاتے ہوئے اپنے منشور میں واضح کہا ہے کہ برطانیہ میں بھاری صنعتکاری کا عمل رک چکا ہے اور حکومت اس میں کسی بھی قسم کی کوئی سرمایہ کاری نہیں کر رہی بلکہ اس کی جگہ اشیاء صرف کی طرف زیادہ دھیان دیا جا رہا ہے پارٹی نے اس مقصد کے لئے ۲۵۰ بلین پاؤنڈ سرمایہ کاری کی تجویز دی ہے تا کہ اس سے ملازمتوں کے نئے ذرائع بھی کھلیں، لیبر پارٹی حکومت کی طرف سے صحت کے شعبے میں ہر سال کمی ہوتی ہوئی سرمایہ کاری کا ذکر کرتے ہوئے اضافی طور پر ۳۰ بلین پاؤنڈ کی صحت کے شعبے میں سرمایہ کاری کی تجویز دی ہے اور اس مقصد کے لئے معاشرے کے سب سے زیادہ آمدنی رکھنے والے ۵ فیصد امیر ترین افراد سے اضافی ٹیکس وصول کیا جائے، پارٹی نے صحت کے شعبے میں نجکاری کے تحت اٹھائے گئے تمام اقدامات کو فوری طور پر واپس کر کے صحت کا تمام شعبہ مکمل طور پر سرکاری کنٹرول میں لانے کی تجویز دی ہے۔

لیبر پارٹی ان تجاویز کا عام لوگوں کی روزمرہ زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے برطانیہ کے شہریوں نے بڑی تعداد میں لیبر پارٹی کے حق میں ووٹ دالے، لیبر پارٹی کا انتخابی منشور کئی لحاظ سے اہم ہے اول تو یہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نجکاری کا تجربہ کوئی اتنا کامیاب نہیں رہا بلکہ اس سے سماجی تفریق میں مزید اضافہ ہوا، دوئم یہ کہ آج بھی سرکاری شعبہ زیادہ بہتر طریقے سے لوگوں کو سہولیات فراہم کر سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ صورتحال پاکستان میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کے لئے بھی حوصلہ افزا ہے، پاکستان میں کام کرنے والی سیاسی جماعتوں کو عوام کے حقیقی مسائل سے آگہی حاصل کرنا ہوگی اور پھر ان مسائل پر تحقیق کر کے متبادل تجویز کرنا ہوگا یقیناً عوام اس بات کو ضرور سنیں گے۔

☆☆☆

ایک دن کا فکری اسکول

(۱) ملکی اور عالمی سیاسی صورتحال کا جائزہ اور ہماری سیاست (اثر امام)

(۲) سوشلزم اور سرمایہ داری سے آگے (ڈاکٹر سکندر مغل)

(۳) داس کیپٹال اور آج کی سرمایہ داری (ڈاکٹر بخشل تھلو)

منجانب: پروگیسو فکری فورم (لاڑکانہ)

عوامی ورکرز پارٹی لاڑکانہ کے پروگریسو فکری فورم کی جانب سے داس کیپٹال کی 150 سالہ اور بالشویک انقلاب کی 100 سالہ سالگرہ کی نسبت سے عیدالفطر کے تیسرے دن آرٹس کاؤنسل آف پاکستان کے بھٹائی ادبی ہال میں ایک دن کا فکری اسکول ہوا جس میں سینکڑوں سیاسی سماجی کارکنان نے شرکت کی۔ پروگرام میں ویلکم تقریر میں ضلعی جنرل سیکریٹری جناب غفار خان نے کہا کہ نظریاتی تربیت کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا جس کو عوامی ورکرز پارٹی کی جانب سے ایک دور کے بعد پھر سے شروع کیا گیا ہے۔ اس گمبھیر صورتحال میں ہمیں اس دور کی سرمایہ داری اور سیاست کو سمجھنے کے لے اس ایک دن کے پروگرام منعقد کیا ہے جس میں سب ہی شریک ساتھیوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ملکی اور عالمی سیاسی صورتحال کا جائزہ اور ہماری سیاست کیعنوان پر کامریڈ اثر امام نے لیکچر دیتے وقت کہا کہ جس معاشی صورتحال تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اس صورتحال میں ہمیں بائیں بازو کی سیاست کو مضبوط کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سکندر مغل نے لیکچر دیتے وقت کہا کہ سویت یونین کے خاتمے کے بعد سرمایہ دار دانشوروں کا کہنا تھا کہ تاریخ کا خاتمہ ہو گیا بلکہ جب تک سماج طبقات پر تقسیم ہے تب تک یہ طبقاتی وجہ بھی رہے گی۔ کلاسیکل سوشلزم پر اگر تنقید کر بھی لیں پر سماج کا پھر بھی حل اسی ہی غیر طبقاتی سماج میں ہے۔ ڈاکٹر بخشل تھلسو نے کہا کہ معیشت اور سیاست کو الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ بورجوا معیشت دان کہتے ہیں کہ سوشلزم مر چکا ہے، اور ہم سائنسی سوچ رکھنے والے بینروں کو اس طرح نہیں دیکھتے۔

پروگرام میں کامریڈ فوزیا سینگار نے عورتوں کے حوالے سے گیت بھی گائے۔

☆☆☆

پس منظر

پاکستان میں جاگیردارانہ باقیات

اثر امام

پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پورے ایشیا میں جاگیردارانہ سماجی معاشی نظام اس طرح سے کبھی بھی موجود نہیں رہا ہے۔ جس طرح کہ وہ 9ویں اور 13ویں صدی عیسوی کے درمیان یورپ کے مختلف ممالک میں موجود رہا۔ نہ صرف جاگیردارانہ نظام بلکہ تمام ماقبل سرمایہ دارانہ نظاموں کی شکلیں ہندوستان میں یورپ کے مقابلے بالکل مختلف رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کارل مارکس نے ہندوستان کے مطالعے کے دوران ایشیاٹک موڈ آف پراڈکشن یا ایشیائی طرزِ پیداوار کی ایک نئی اور مخصوص اصطلاح استعمال کی ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک فرانسیسی سیاح ڈاکٹر فرانکو برنیئر ہندوستان کی سیر کرنے کیلئے یہاں آیا تھا۔ اور قریب 9 سال تک دہلی میں اقامت پذیر رہا۔ کارل مارکس نے ہندوستان کے متعلق اپنے نظریات وضع کرتے وقت اس کے سفرنامے میں دی گئی معلومات پر بھی کافی کچھ انحصار کیا ہے۔ اسی برنیئر نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں ساری زمین بلا شرکت غیرے بادشاہ سلامت کی ملکیت ہے۔ لوگ اسے کاشت کر سکتے ہیں لیکن اس کی خرید و فروخت نہیں کر سکتے اور نہ اپنی اولادوں کو ورثے میں دے سکتے ہیں۔ یہیں سے مارکس نے نتیجہ نکالا کہ ہندوستان میں کم از کم زمین کی حد تک تو نجی ملکیت کا تصور موجود نہیں تھا۔ اور مارکس کا خیال تھا کہ ایسا مسلمان حکمرانوں کی وجہ سے ہوا تھا لیکن سبطِ حسن نے لکھا ہے کہ کارل مارکس یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب نہیں تھے کہ زمین پر سے نجی ملکیت کا خاتمہ مسلمانوں یا مغل شہنشاہوں کی دین تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں زمین اس وقت بھی راجہ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی جب اسلام ابھی معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس سلسلے میں سبطِ حسن صاحب نے ارتھ شاستر، موریا عہد کے یونانی تاریخ نویس میگا سیتھنز اور آنجہانی کوسامبی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر رومیلا تھاپڑ کا ماننا بھی یہی ہے کہ کم از کم موریا عہد تک بھی ہندوستان کی ساری زمین راجہ کی ملکیت سمجھی اور تسلیم کی جاتی تھی۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو جاگیردار موجود تھے خاص طور پر مغل عہد میں، جنہیں منصب دار بھی کہا جاتا تھا، ان کی کیا حیثیت تھی؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے سلجوقیوں کے مشہور وزیر نظام الملک طوسی نے بہت خوب لکھا ہے: جاگیرداروں، جو مختلف جاگیروں پر قابض ہیں، کو جان لینا چاہیے کہ ان کو رعایا پر اس کے سوا کوئی اختیار نہیں ہے کہ محاصل، جن کی وصولی کے وہ ذمہ دار ہیں، رعایا سے بطرزِ احسن وصول کریں اور سرکاری خزانے میں جمع کرائیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے کے جاگیردار اپنی جاگیروں کے مالک نہیں بلکہ نگہبان تھے۔ جن کا کام تھا بادشاہ سلامت کی طرف سے عائد کردہ لگان وصول کرنا، اس میں سے طے شدہ حصہ اپنے لیئے رکھنے کے بعد باقی شاہی خزانے میں جمع کرا دینا، ضرورت پڑنے پر شاہی فوج کیلئے سپاہیوں کی بھرتی کا انتظام کرنا اور اپنے علاقے میں امن امان قائم رکھنا۔ زمین پر ان کے مالکانہ حقوق بالکل نہیں تھے۔ لیکن چونکہ ریاست کے بعد یہی سب سے طاقتور طبقہ تھے۔ لہٰذا مغل سلطنت کے کمزور پڑتے ہی ان جاگیرداروں نے زمین کے مستقل مالکان کی حیثیت اختیار کرنا شروع کر دی۔

یورپ کے صنعتی و تجارتی شہر دو طرح کی شناخت رکھتے تھے۔ ایک وہ جو آزاد اور خودمختار ری پبلک تھے جس طرح میلان، فلورینس، وینس اور جنیوا وغیرہ ان پر فیوڈل قوتوں کا اثر نہیں چلتا تھا۔ یا پھر وہ شہر جنہوں نے جاگیرداروں، نوابوں سے طویل اور خونریز لڑائیاں لڑ کر شہری حقوق اور تجارتی سندیں حاصل کر رکھی تھیں۔ جیسے لندن، مارسیلز، اینٹ ورپ اور لائز یگ وغیرہ۔ نوابوں کے مقابلے انہیں شاہانِ وقت کی مدد حاصل تھی۔ ان کی سیاسی اور اقتصادی قوت میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا رہا یہاں تک کہ 18ویں صدی میں انہوں نے پیش قدمی کی اور حکومت کی باگ ڈور براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مگر ہندوستان میں اس سلسلے میں گنگا الٹی ہی بہہ رہی تھی۔ مثلاً تیرہویں اور چودہویں صدی میں جنوبی ہند اور سمندر کنارے واقع زیادہ تر صنعتی و تجارتی شہروں میں خودمختار اسمبلیاں موجود تھیں اور تاجروں کی آزاد تنظیمیں بھی۔ ان شہری اسمبلیوں کا کام فقط امنِ عامہ کا قیام ہی نہیں تھا بلکہ وہ محصولات کا تعین کرتیں، تاجروں اور دستکاروں سے واجبات وصول کرتیں اور مقدموں کے فیصلے سناتی تھیں۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ان شہری اسمبلیوں اور تنظیموں کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہونے کی بجائے فیوڈل ریاست کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا اور بالآخر ان شہروں سے آزادی اور خودمختاری سلب کر لی گئی۔ واجبات کا تعین اور وصولی اب سرکاری حکام کرنے لگے۔ شہری اسمبلیاں ختم کر دی گئیں۔ دستکاروں اور دکانداروں سے حاصل شدہ رقمیں فیوڈل اُمراء کو بخش دی گئیں۔ تیرہویں صدی کے اواخر اور چودہویں صدی کے اوائل میں بادشاہ شہر کے شہر ان اُمراء کے حوالے کرنے لگے۔ اس وقت سے بیوپاری اپنی تمام تر دولتمندی کے باوصف فیوڈل اُمراء کے شاہانہ مزاج کے تابع ہونے لگے۔ اگر وہ ان مطلق العنان حکمرانوں کو مطلوبہ رقم پیش نہیں کرتے تھے تو انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا تھا اور حتیٰ کہ قید خانوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔

سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں جب دہلی کا فیوڈل مرکز کمزور پڑنے لگا تو سندھ، بنگال، بہار، اودھ اور دیگر علاقوں نے بغاوت کر کے اپنی خودمختار

ریاستیں قائم کرنا شروع کر دیں۔ لیکن مرکز سے کٹ کر جو خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں وہ بھی اسی فیوڈل نظام کے دائرے میں بنی رہیں۔ سرمایہ داری کی طرف پیش قدمی نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں جس وقت اس ساری شکست و ریخت کے نتیجے میں جگہ جگہ خود مختار ریاستیں جنم لے رہی تھیں اور کسانوں، جاٹوں اور راجپوتوں وغیرہ کی بغاوتیں عروج پر تھیں، ہمیں کہیں تاجروں اور بیوپاریوں کی فیوڈل قوتوں کے خلاف مسلح ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اسی بنا پر سبطِ حسن صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان میں جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف عبور اس وجہ سے بھی نہیں ہو پایا کہ ہمارے یہاں کے تاجر طبقات نے فیوڈل ازم کے خلاف لڑائی لڑنے کی نہ کبھی ضرورت محسوس کی اور نہ اس طرح کی کوشش کی۔ مزید برآں وہ اس مفروضے کو رد کرتے ہوئے کہ اگر انگریز یہاں نہ بھی آیا ہوتا تو ہندوستان میں سرمایہ داری خود بہ خود آ جاتی تھی، لکھتے ہیں: پرتگالی امیر البحر نے 1510 میں گووا پر قبضہ کیا تھا جو راجہ بیجاپور کا جزیرہ تھا۔ بمبئی 1668 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ تسلط آئی۔ مدراس کو انگریزوں نے 1638 میں زیرِ نگیں کیا۔ جبکہ سندھ سمیت وہ سارا علاقہ جو اب پاکستان کہلاتا ہے 1843 سے 1863 تک فتح کیا گیا۔ مغربی قوتوں نے سترہویں اور اٹھارویں صدی کے دوران اس علاقے کو براہ راست بالکل نہیں چھیڑا تھا۔ چنانچہ ان علاقوں میں اگر فیوڈل ازم کو خود بہ خود ختم کرنے کی اہلیت موجود تھی تو اس کیلئے دو سو برس کا عرصہ کچھ کم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے فیوڈل نظام میں تجارتی سرمائے کی حیثیت محض دلال کی تھی۔ بیوپاری طبقہ شہر اور دیہات کے دستکاروں کی مصنوعات کو بیشتر حاکم طبقے کے ہاتھ فروخت کر کے نفع کماتا تھا۔ لہٰذا اس کا مفاد فیوڈل نظام کی بقا میں تھا اس کو فنا کرنے میں نہیں۔ یورپ کے برعکس ہمارے یہاں کے تاجر طبقے کا دستکاروں کے آلاتِ پیداوار پر مالکانہ حق نہیں تھا۔ وہ دستکاروں کی فاضل پیداوار اور قوتِ محنت کا مالک نہیں تھا۔ یعنی پیداواری عمل کے دوران استحصال نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ مال کے گردش میں آنے کے بعد طلب اور رسد کے قانون کے تحت مال بیچ کر نفع کماتا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد

پاکستان میں زرعی شعبے کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں تو ہم سارے ملک کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن زیادہ تر توجہ سندھ اور پنجاب پر دیتے ہیں۔ کیونکہ ملک کی 80 فیصد تک آبادی صرف انہی دو صوبوں میں رہتی ہے۔ زرعی محنت کش قوت کا 85 فیصد، زیر کاشت زمین کا 85 فیصد، آب پاشی کے ذریعے آباد زمین کا 92 فیصد، جس زمین میں مختلف فصلیں اگائی جاتی ہیں، کا 88 فیصد، اہم فصلوں اور ذرائع خوراک کا 89 فیصد، مالکانِ اراضی کا 79 فیصد اور مالکانہ تسلط کے تحت زمین کا 89 فیصد انہی دو صوبوں سے متعلق ہے۔ چنانچہ پنجاب اور سندھ کی مثال سامنے رکھتے ہوئے پاکستان میں زراعت اور جاگیری باقیات کے سوال پر بات کرنا اور نتائج اخذ کرنا کچھ زیادہ غلط بھی نہیں ہوگا۔

پاکستان کو ورثے میں حاوی جاگیردارانہ اور چھوٹے پیمانے کی کاشت کا نظام ملا تھا۔ سرمایہ داری اس سے بھی بعد میں آتی تھی۔ 1924 میں جن زمینداروں کے پاس 150 ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین کی ملکیت تھی وہ کل آبادی کا محض 3۔3 فیصد تھے جبکہ ان کے قبضے میں زیر کاشت رقبے کا 7۔25 فیصد تھا۔ 1939 کی شماریات میں واضح ہوا کہ اب ان بڑے زمینداروں کی آبادی تو کم ہوئی تھی یعنی 4۔2 فیصد لیکن ان کے قبضے میں جو زمین تھی وہ کل زیرِ کاشت زمین کا 38 فیصد ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ کہ زمین کی ملکیت میں ارتکاز بڑھنے کا رجحان زیادہ تھا۔ پھر جب 1955 کی شماریات پر نظر ڈالیں تو پتہ لگتا ہے کہ پاکستان میں بڑے زمینداروں، جن کے پاس کم از کم 500 ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین تھی، کی آبادی ملک کی مجموعی آبادی کا محض 1۔0 فیصد تھی لیکن ان کے قبضے میں کل زیرِ کاشت رقبے کا 4۔15 فیصد تھا۔ پنجاب میں یہ تناسب 1۔0 فیصد اور 9۔9 فیصد تھا جبکہ سندھ کے اندر ان بڑے زمینداروں کی آبادی 9۔0 فیصد اور زیرِ قبضہ زمین 1۔29 فیصد تھی۔ 1955 کے بعد صرف 1972 کے زرعی اصلاحات کے اعلان کا زمانہ ایسا دور ہے، جس میں زمین کی ملکیت میں موجود فرق ایک حد تک کم نظر آیا یعنی زمین کی تقسیم میں جو عدم برابری 1960 میں 5992۔0 تھی وہ 1972 میں 4215۔0 تک آ گئی۔ جبکہ 1972 سے لیکر 2000 تک زمین کی تقسیم میں عدم برابری کی شرح میں نمایاں اضافہ دیکھنے کو ملا ہے اور وہ 609۔0 ہو گیا ہے۔ جس کا آسان مطلب یہ ہے کہ چھوٹے مالکانِ زمین مجبور کیے جا رہے ہیں کہ وہ اپنی زمینیں بڑے زمینداروں کے ہاتھ فروخت کر دیں یا پھر ان کی زمینیں مسلم قوانینِ وراثت کی نذر ہو کر ان کی اولادوں میں تقسیم در تقسیم ہو گئی ہیں۔ البتہ اسی عرصے کے دوران ایسی زمینیں جنہیں مالکان خود کاشت کرتے یا کراتے ہیں میں اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً 1960 سے 2000 تک یہ زمینیں 36 فیصد سے بڑھ کر 73 فیصد تک پہنچی ہیں۔ جبکہ پیداوار میں حصہ داری کے سسٹم کے تحت کاشت ہونے والی زمینوں میں کمی آئی ہے۔ جو کہ 1960 میں 23 فیصد سے کم ہو کر 2000 میں محض 5۔14 فیصد رہ گئی ہیں۔ تاہم سال 2000 کے زرعی شماریات کے مطابق زراعت کے شعبے میں مستقل اجرتی محنت کشوں کی موجودگی کل زرعی محنت کشوں کا محض 8۔3 فیصد ہے۔ بہر حال اس ساری صورتحال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے اندر زرعی شعبے میں سرمایہ داری آ تو رہی ہے لیکن یہاں اب بھی جاگیردارانہ باقیات موجود ہیں۔

بعد کے زمانوں میں ہر چند کہ زرعی اصلاحات بھی کی گئیں لیکن زمین پر نجی ملکیت کے اس حق میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ہزاروں اور بعض جگہوں پر تو لاکھوں ایکڑ تک کا رقبہ کسی ایک خاندان کی نجی ملکیت بنا رہا۔ زیادہ تر کاشت پیداوار میں حصہ داری یعنی بٹائی سسٹم کے تحت کی جاتی رہی جو آج بھی جنوبی پنجاب اور تقریباً سارے سندھ کا حاوی زرعی طریقِ پیداوار ہے۔

اس وقت پاکستان میں کون سا زرعی نظام موجود ہے؟ اس سوال کے جواب میں محمود حسن خان رقم طراز ہیں: پاکستان میں بنیادی طور پر تین زرعی نظام جاگیرداری، کسان اور ابھرتا ہوا سرمایہ دارانہ نظام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ جاگیرداری نظام میں زمیندار بٹائی پر کاشت کرنے والے بے زمین کسان کو زمین کا ایک ٹکڑا مہیا کرتا ہے۔ جسے وہ اپنے جانوروں اور اپنی خاندانی محنت کی مدد سے کاشت کرتا ہے۔ اس میں زمین کے کرائے اور محنت کی اجرت کیلئے پیداوار کو دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ لیکن پیداوار پر آنے والے خرچ کی کوئی واضح تقسیم نہیں ہے۔ دوسرا حاوی نظام کسان خاندانوں کا ہے۔ جس میں غریب اور درمیانے درجے کے وہ کسان بھی شامل ہیں جو اپنے خاندانی کھیتوں پر خود کاشت کرتے ہیں۔ ہر مالک خاندان کا انحصار

اپنے جانوروں اور اپنی قوتِ محنت پر ہی ہوتا ہے۔ تیسرا نظام سرمایہ دار کاشت کار کا ہے جو زمین پر اجرتی محنت کو استعمال کرتا ہے اور قدرِ زائد کو سرمائے کیلئے منافع کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر آج کے زمانے میں پاکستان کے اندر زراعت کا شعبہ ملی جلی معیشت اور جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کے زیرِ اثر ہے۔ ایسے زمین مالکان یا بڑے زمیندار بھی ہیں جو اپنے کھیتوں میں پیداوار کا ایک حصہ دیگر کاشت کرواتے ہیں۔ جسے کسان، ہاری یا مزارع کے ذریعے کاشت کروانا کہا جاتا ہے۔ لیکن ایسے چھوٹے زمیندار بھی موجود ہیں جن کے پاس اتنا کم رقبہ ہے کہ وہ خود اور ان کا خاندان ہی اپنی محنت سے اسے کاشت کر لیتا ہے۔ ان دونوں مظاہر کی دیکھا دیکھی ایک اور مظہر زراعت میں سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کا تیزی سے دخل ہے۔ جس کے تحت زمین کاشت کرنے والا زمین کا مالک نہیں ہوتا لیکن وہ پیداوار میں سے ایک مخصوص حصے کا مالک بھی نہیں ہوتا۔ وہ اجرتی مزدور ہوتا ہے جو زمین کاشت کرنے کی اجرت حاصل کرتا ہے۔

پاکستان کے اندر زراعت سے وابستہ لوگوں کی پانچ بڑی قسمیں یا طبقات ہیں۔

1۔ زمیندار

یہ زمین کے بہت بڑے علاقے کے مالک ہوتے ہیں۔ تقریباً ساری اس زمین کو چھوٹے چھوٹے قطعوں کی صورت بے زمین کسانوں کو بٹائی پر کاشت کرنے کیلئے دے دیتے ہیں۔ وہ خود کوئی محنت نہیں کرتے۔ بلکہ کسان ہی کو ساری محنت مہیا کرنی پڑتی ہے۔ یہاں منافع اور اجرت کا معاشی ترغیب کے طور پر کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ زیادہ تر سندھ اور جنوبی پنجاب میں پائے جاتے ہیں۔

2۔ امیر کسان

زیرِ کاشت رقبے کا بہت بڑا حصہ ان کی اپنی ذاتی ملکیت ہوتا ہے جبکہ کچھ حصہ انہوں نے ٹھیکے یا کرایے پر لے رکھا ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر پنجاب اور تھوڑے بہت سندھ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کیلئے پیداوار کی بنیاد اور قدرِ زائد حاصل کرنے کا ذریعہ دوسروں کی محنت کا استحصال ہوتا ہے۔

3۔ غریب اور درمیانے درجے کے کاشتکار

یہ طبقہ ایسے خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنی کاشت کردہ زمین کے ایک حصے کے مالک ہوتے ہیں یا اسے کرایے یا ٹھیکے پر لیتے ہیں حتیٰ کہ یہ اپنی زمین کا ایک حصہ کرایے یا ٹھیکے پر دے بھی سکتے ہیں لیکن یہ لوگ پیداوار کیلئے تقریباً پورے طور پر خاندانی یا گھریلو محنت پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ عام طور پر دوسروں کیلئے محنت نہیں کرتے اور نہ ہی دوسروں کو اپنے کھیتوں پر مزدور کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔

4۔ بٹائی پر کاشت کرنے والے کسان/ ہاری

دوسروں سے زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بٹائی پر لیتے ہیں۔ اس طبقے کی موجودگی پاکستان کے ان تمام علاقوں میں نظر آسکتی ہے جہاں جاگیردرانہ باقیات اب بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

5۔ اجرت پر کام کرنے والے مزدور

یہ طبقہ ایسے بے زمین محنت کشوں پر مشتمل ہے جو اپنی محنت کو فروخت کر کے روزی کماتے ہیں۔ عام طور پر امیر کسانوں یا سرمایہ دار کاشتکاروں کیلئے کام کرتے ہیں۔ انہیں اجرت کا کچھ حصہ نقد اور کچھ حصہ جنس کی صورت ادا کیا جاتا ہے۔ یہ مستقل طور پر کام کر سکتے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر کو موسمی طور پر ہی کام ملتا ہے۔ یہ زراعت سے باہر بھی محنت کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستان کے اندر زراعت اور صنعت کی ابھرتی ہوئی پرولتاریہ انہی سے متشکل ہوتی ہے۔

پاکستان کے اندر جاگیردارانہ باقیات کئی معنوں میں موجود ہیں۔

1۔ معاشی

ملک میں بڑے بڑے رقبوں کے مالکان موجود ہیں جو خود زمین کاشت نہیں کرتے۔ بلکہ پیداوار میں سے ایک حصہ کسانوں کو دے کر ان کی پیدا کردہ قدرِ زائد کا استحصال کرتے ہیں۔ ان جاگیرداروں نے زمین کے علاوہ کچھ دیگر کاروبار بھی شروع کر رکھے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ان کی آمدن کا بنیادی ذریعہ زمین ہی ہے۔

2۔ سماجی

معاشرے میں ان کا رتبہ اور حیثیت زمین اور اس پر کام کرنے والے لوگوں کی بدولت بنا رہتا ہے جو ایک طرح سے ان کی مرضی کے پابند ہوتے ہیں۔ ہم انہیں کسی بھی طرح آزاد محنت کش نہیں شمار کر سکتے۔ سماج میں ان جاگیرداروں کی عزت اور حیثیت ان کے اچھے کردار اور اہلیت کی بنا پر نہیں بلکہ اس ملکیت کی بنا پر ہوتی ہے جو وہ بالخصوص زمین کی صورت رکھتے ہیں۔ وہ جس علاقے میں رہتے ہیں، لوگ ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ حکومتوں کو بھی ان جاگیرداروں کی مرضی کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ عوام کے مختلف مسائل اور معاملات کی صورت میں مقدموں کا فیصلہ سناتے ہیں۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کی طرف سے بارہا سختی سے منع کرنے کے باوجود یہ جاگیردار جرگے بلاتے رہتے ہیں اور وہاں لوگوں کے مقدمے سن کر فیصلے سناتے ہیں جو یقیناً ایک متوازی عدالتی نظام چلانے کے مترادف ہے۔

3۔ سیاسی

زرعی زمین کے بل پر یہ لوگ انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور زیادہ تر اپنے کسانوں اور ان کے خاندانوں کے ووٹ لیکر ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ منتخب اسمبلیوں میں بیٹھتے ہیں۔ اپنے حق میں اور عوام کے خلاف قانون سازی کرتے ہیں۔ ٹیکس چوری کرتے، قرضے معاف کرواتے اور سرکاری خزانے کی لوٹ مار کرتے ہیں۔ اپنے علاقے کا پولیس افسر ان کا خادمِ خاص ہوتا ہے اگر وہ انہیں اپنا مائی باپ تسلیم نہیں کرتا تو اس کا تبادلہ کرا دیتے ہیں اور بعض صورتوں میں تو ڈاکوؤں کے ساتھ مقابلے میں شہادت بھی اس کا نصیب ہو سکتی ہے۔ ریونیو ڈپارٹمنٹ ان کے مکمل قبضے میں ہوتا ہے لہٰذا 2 ایکڑ زمین رکھنے والے غریب کسان کو تو سالانہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے لیکن ہزاروں لاکھوں ایکڑ کے مالک یہ جاگیردار اتنا رعب رکھتے ہیں کہ ایک پٹواری کے بس کی بات نہیں کہ وہ ان سے ٹیکس وصول کر سکے۔ لہٰذا وہ اپنے لیے تھوڑا سا جیب خرچ حاصل کر کے جاگیردار کی زمین کو بنجر دکھا کر اسے ٹیکس ادا کرنے سے بچنے کا قانونی بہانہ پیش کرتا ہے۔ محکمہ آبپاشی ان کے کنٹرول میں ہوتا جس وجہ سے وہ اپنے کھیتوں کیلئے پانی چراتے ہیں اور اپنے مخالفوں کی زمینوں کیلئے پانی کی قلت کا مسئلہ ہمیشہ بنائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح علاقے کے

اسکول اور ہسپتال تعمیر کرنے کا ٹھیکہ بھی کسی نہ کسی طرح اسی جاگیردار کے پاس ہوتا ہے لیکن اس اسکول میں بچوں کو تعلیم کبھی نہیں دی جاتی اور نہ ہسپتال میں مریضوں کا علاج ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یہ سرکاری عمارتیں جاگیردار کے مویشیوں کے باڑے بنا دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر انہیں زمین سے محروم کرنا ممکن بن جائے تو ان کی سیاسی قوت کو آسانی کے ساتھ توڑا جاسکتا ہے۔

4۔ ثقافتی

ان باقی ماندہ جاگیرداروں کا ہماری ثقافتوں پر بھی گہرا اثر موجود ہے۔ توہم پرستی، پیر پرستی، زندہ سلامت لوگوں کا مزاروں اور بدحواس باباؤں کے رحم و کرم پر زندہ رہنا، غیرت کے نام پر قتل کی وارداتیں اور کم عمری کی شادیاں، اپنے خاندان سے باہر شادی کرنے کی ممانعت اور بچیوں کی تعلیم پر قدغن، خواتین کے ملازمت کرنے پر اعتراض اور ان کے خلاف جنسی ہراسگی کے آئے دن رپورٹ ہورہے واقعات حتیٰ کہ این۔ جی۔ اوز اور تحریک نسواں میں سرگرم خواتین تک کا جاگیردارانہ ذہنیت کا شکار ہو کر کثرتِ ازدواج وغیرہ کی لپیٹ میں آجانا، نیز قبائلی لڑائیاں، مذہبی تنگ نظری، مذہبی جنونیت، انتہاپسندی اور مساجد اور مدارس کا تیزی سے پھیلتا ہوا نیٹ ورک صرف سعودی عرب اور مشرقِ وسطیٰ کی دیگر ریاستوں کی فنڈنگ کی مرہونِ منت ہی نہیں بلکہ ہمارے ہاں جاگیردارانہ باقیات کا کلچر میں شامل رہنا بھی ان کیلئے حالات سازگار بنا رہا ہے۔

5۔ نفسیاتی

انتہا درجے کی انا پرستی اور خود پسندی، فیس بک پر دیکھیں تو خانوں، سرداروں، نوابوں، نواب زادوں، کنگوں، پرنسوں، اور میروں سے دنیا بھری ملی گی۔ نوجوان خاص طور پر دیہی علاقوں کے نوجوان اپنے گاؤں کے جاگیردار کی نقل کرتے ہیں۔ اگر وہ جاگیردار کی طرح نایاب نسل کے پرندوں کا شکار نہیں کھیل سکتے تو بیچارے ادنیٰ نسل کے پرندوں کی نسل کشی کر کے ہی خوش ہو جاتے ہیں اور ان مقتول پرندوں کے ساتھ فوٹو بنواتے اور اسی طرح فیس بک پر شیئر کر کے خوش ہوتے ہیں جس طرح ایک جاگیردار یا اس کا بیٹا کرتا ہے۔ ہم اپنے مخالف کو کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ سیاسی اور نظریاتی اختلافات کو ذاتی اختلافات کا رنگ دے دیتے ہیں۔ ہم مل جل کر کام نہیں کرسکتے۔ ہم اپنے بھائی تک کو بھی ہمیشہ نیچا دکھانے کی تاک میں ہوتے ہیں۔

لہٰذا پاکستان میں جاگیردارانہ باقیات محض ایک واہمہ نہیں ہے اور نہ اسے "نام نہاد" کہہ کر اس کی تردید کی جاسکتی ہے۔ پاکستان میں جاگیردارانہ باقیات اور اثر رسوخ کی موجودگی سے مکمل طور پر منکر دانشوروں اور (معدودے چند) سیاسی کارکنوں کو ایک طرف یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ملک میں اب بھی بڑی زمینداریاں موجود ہیں۔ اسی معاشی قوت کی بنا پر ان جاگیرداروں/زمینداروں کی سیاسی قوت اور سماجی رتبہ قائم ہے۔ آج ملک کی قومی خواہ صوبائی اسمبلیوں میں دیہی علاقوں سے ووٹ حاصل کرنے والے تقریباً سارے ممبران کے ووٹروں کی اکثریت ان کے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کی ہوتی ہے۔ سیاسی پارٹیاں انتخابات سے پہلے ٹکٹ دیتے وقت یہ دیکھتی ہیں کہ امیدوار کے اپنے بل بوتے پر جیت کے امکانات کس قدر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا اس کی زمین اور زمین سے جڑے کسانوں کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاتا ہے۔ آپ کے کارخانے میں کام کرنے والا مزدور ضروری نہیں ہوتا کہ ووٹ بھی آپ کو دے گا۔ لیکن آپ کے کھیتوں میں کام کرنے والا کسان آپ کو ووٹ نہیں دے گا تو نہ صرف روزگار کھوئے گا بلکہ گھر سے بیدخل کیا جائے گا اور عین ممکن ہے کہ جیل چلا جائے، اس کی بیٹی یا بہو اغوا ہو جائے، بھینس یا گائے چوری ہو جائے اور اگر وہ زمیندار کا مقروض ہے تو قرض کی عدم ادائیگی کی بنا پر جبری مشقت کرنے والے مزدور میں بدل دیا جائے۔ سندھ اور پنجاب کے جن علاقہ جات میں ان جاگیرداروں کا اثر رسوخ اب بھی موجود ہے آپ وہاں جا کر تو دیکھیں۔ آپ کو محسوس ہوگا گویا قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں واپس ہوگئے ہیں۔ یہ جاگیردار گاؤں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ سارے مقدموں کے فیصلے کرتے ہیں۔ سزائیں سناتے ہیں۔ جرمانے عائد کرتے ہیں۔ حکم عدولی کرنے والے کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان کی اپنی نجی جیلیں بھی ہیں۔ وہ کسانوں کا مال مویشی چوری کرواتے ہیں۔ اگر ان کے ہاتھ سے کسی کا قتل بھی ہو جائے تو پولیس ان کے خلاف مقدمہ دائر نہیں کرسکتی۔ میڈیا کو جرئت نہیں ہوتی کہ ان کے خلاف خبر نشر کرے۔ ان کے خلاف کسی سنگین جرم کا الزام ہو تب بھی انتہائی طاقتور اخبارات بھی ان کا نام شایع کیے بغیر بس اس طرح خبر چھاپ دیتے ہیں کہ ایک بااثر نے ایسا یا ویسا کیا ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کیا ایسا تب بھی ممکن ہوگا اگر ان لوگوں کو زمین پر حقِ ملکیت سے محروم کردیا جائے؟ کیا بے زمین کسانوں کو ان کی زمینیں بانٹ کر ان کے جبر وقہر سے نجات نہیں دلائی جاسکتی؟

1970 کی دہائی میں زرعی اصلاحات کے بعد سے پنجاب خواہ سندھ میں بڑے قطعاتِ اراضی میں کمی آئی ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر اکبر زیدی صاحب اور اس کے ماننے والے اس بات سے منکر ہیں کہ پاکستان میں کوئی جاگیری باقیات موجود ہیں۔ حالانکہ ایک طرف وہ اس بات پر دلیل بازی کرتے ہیں کہ بڑے قطعاتِ اراضی کا مالک ہونا جاگیردار ہونے کے مترادف نہیں ہے۔ دوسری جانب وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ اب زمین کے چھوٹے قطعات کے مالکان کی آبادی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے لہٰذا یہ ایک اشارہ ہے کہ پاکستان کے اندر جاگیردارانہ باقیات موجود نہیں ہیں اور جاگیرداری یا جاگیردارانہ باقیات کی بات کرنا بنیادی طور پر سرمایہ داری کے خلاف جنگ کو مؤخر کرنے کا حربہ ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ مارکسی تعلیمات کی روشنی میں طبقات کی شناخت اور ساخت اس سے طے نہیں ہوتی کہ کس کے پاس کتنی زمین ہے؟ بلکہ اس سے کہ ذرائع پیداوار کا مالک کون ہے۔ اب چونکہ زمین ایک بنیادی اور اہم ذریعہ پیداوار ہے لہٰذا اگر زمین نجی ملکیت ہے اور اس کا مالک اس پر دوسرے محنت کشوں کی محنت سے قدر زائد اپنے نام کرتا ہے تو اس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری بات یہ کہ کام کے دوران لوگوں کے آپسی رشتے کس نوعیت کے ہیں؟ جسے ہم عرف عام میں پیداواری رشتے کہتے ہیں۔ اگر تو زمین پر محنت کرنے والا اجرتی مزدور ہے تو سمجھا جائے گا کہ زراعت سرمایہ دارانہ رشتوں تک عبور کرچکی ہے۔ لیکن اگر وہ پیداوار میں سے حصہ لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ کہ زمین سے جڑے پیداواری رشتے ہنوز جاگیردارانہ ہیں۔ جاگیرداری کا خاتمہ جدید زرعی مشینری، کھاد، بیج اور جراثیم کش ادویات کے استعمال سے نہیں ہو جاتا اور نہ اس سے کہ 1947 میں زرعی پیداوار کا 12 فیصد منڈی کیلئے جبکہ آج اس کا 80 فیصد منڈی کیلئے پیدا کیا جارہا ہے بلکہ زمین کے مالک اور اس پر کام کرنے والے محنت کشوں کے رشتوں میں تبدیلی سے بندھا ہوا سوال ہے یہ۔ اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ سندھ کے بیشتر جبکہ پنجاب کے جنوبی حصے میں کھیتی باڑی کا چلن اب بھی اسی طرح ہے؟

قاری کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں جاگیرداری نظام کی باقیات کے منکروں کو اسے قبول کر لینے میں دقت کیا ہے؟ میرے خیال میں ایک تو یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر جاگیری باقیات کو قبول کر لیا گیا تو پھر سرمایہ داری کے خلاف ان کی "جدوجہد" مؤخر ہو جائے گی اور پہلے جاگیرداری اور اسکی باقیات کے خلاف جدوجہد کا سوال اہمیت اختیار کر لے گا۔ دوسرا یہ کہ اگر پاکستان میں جاگیری باقیات کو قبول کر لیا جائے تو پھر قوم، قومی سوال اور قومی تحریکوں کا حال اور مستقبل کھٹائی میں پڑ جائے گا کیونکہ قومی سوال جاگیردارانہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ عہد کا سوال ہوتا ہے۔ تیسرا یہ کہ اگر ملک میں جاگیری باقیات کو تسلیم کر لیا جائے گا تو پھر عوامی جمہوری انقلاب کی راہ اختیار کرنی پڑے گی جو درست راہ ہے جبکہ ہمارے ان "دانشوروں" کا فریضہ قوم کو الجھانا اور گمراہ کرنا ہے درست راہ بجھانا نہیں۔ چوتھا اور شاید آخری سبب اور خوف یہ ہو کہ اگر جاگیری باقیات کو قبول کیا جاتا ہے تو پھر تحریکِ نسواں سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا کیونکہ وہ بھی ماقبل سرمایہ دارانہ سماجی معاشی تشکیلات کی پیداوار اور مظہر نہیں ہے۔

آخری گذارش یہ کہ پاکستان میں کاشت کاری کا پرانا نظام کسی سیدھے راستے پر چل کر ختم کیا جاسکے گا، یہ محض خوش فہمی ہوگی۔ منڈی کی معیشت اور حکومتی پالیسیوں کے نتیجے میں متفرق زرعی ڈھانچے میں مختلف تضادات کام کر رہے ہیں وہ جاگیرداری اور کسان نظاموں کی حاوی خصوصیات کو تیزی کے ساتھ ختم کر رہے ہیں۔ لیکن بہت سے متضاد رجحانات کی وجہ سے امیر کسانوں اور زمینداروں کے خالص سرمایہ دار میں اور غریب کسان اور بٹائی پر کاشت کرنے والے کسانوں کے خالص اجرت پر کام کرنے والے مزدور میں تبدیلی کے عمل میں دیر ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

1. IssuesInPakistan’sEconomybyS.AkbarZaidi
2. TheClassStructureofPakistanbyTaimurRahman
3. CitizensandGovernanceinPakistanbyNadeemMalik
4. India:TransitiontoColonialCapitalismbyHamzaAlvi
5. OntheSocialistTransformationofAgriculturebyV.ILenin
6. MyFeudalLordbyTehminaDurrani
7. زمین کا مسئلہ اور آزادی کی جدوجہد از وی۔ آئی۔ لینن
8. پاکستانی سماج معاشی ارتقا اور سماجی ساخت از ڈاکٹر محمود صادق
9. مارکس اور ایشیائی طرزِ پیداوار از سبطِ حسن
10. پاکستان کا زرعی ڈھانچہ اور طبقات از محمود حسن خان
11. پاکستان ایک جدید نوآبادیاتی ریاست از پروفیسر جمال نقوی

☆☆☆

عید ملن پارٹی

رپورٹ: عابد شکیل فاروقی

عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے زیر انتظام اتوار مورخہ 9 جولائی 2017، ایک عید ملن پارٹی کا اہتمام کیا گیا، جس کا بنیادی مقصد کراچی شہر سے تعلق رکھنے والے پارٹی کے نئے اور پرانے اراکین ایک وقت اور ایک ہی مقام پر ایک دوسرے ملاقات کر سکیں، ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر سکیں، کراچی شہر میں مقیم پارٹی کی مرکزی لیڈرشپ سے ملاقات کر سکیں، ملکی سطح پر پارٹی کی سرگرمیوں، ملکی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کے بارے پارٹی کے موقف اور پارٹی میں مختلف سطح پر جاری نظریاتی اور سیاسی بحث ومباحثے سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

تقریب میں پارٹی کے مرکزی سینئر نائب صدر جناب یوسف مستی خان، پارٹی کے بزرگ رہنما جناب اے۔ آر عارف اور جناب شاہ نور، اے ڈبلیو پی فیڈرل کمیٹی کی سابقہ رکن محترمہ اقبال سلطانہ، ممتاز معاشی تجزیہ نگار جناب نجم الحسن عطاء، انجمن ترقی پسند مصنفین کے جناب مسلم شمیم سمیت کراچی پارٹی کے صدر، جنرل سیکریٹری، ایگزیکیوٹیو کمیٹی کے تمام اراکین، کمیٹی کے دیگر اراکین، عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے تمام یونٹس سے پارٹی اراکین، این ایس ایف گلگت بلتستان سندھ زون کے ساتھی، سیاسی کارکنان، اور پارٹی دیگر ہمدردوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔

تقریب سے عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی سینئر نائب صدر جناب یوسف مستی خان ،عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے سابق صدر اور بزرگ رہنما جناب شاہ نور، انجمن ترقی پسند مصنفین کے جناب مسلم شمیم، جو AWP کے ایک سرگرم رہنما بھی ہیں، معاشی تجزیہ نگار جناب نجم الحسن عطاء اور کراچی پارٹی کی ضلعی کمیٹی کے کامریڈ شفیع شیخ، کامریڈ اشتیاق اعظمی، کامریڈ اقبال سلطانہ کامریڈ ناصر نوشاد، کامریڈ خلیل صدیقی، کامریڈ حسن جاوید، کامریڈ مختار راہو کامریڈ بابر، اور دیگر ساتھیوں نے خطاب کیا، جنہوں نے اپنی اپنی گفتگو میں کراچی میں پارٹی کی سرگرمیوں کے حوالے درپیش مسائل، اپنی اپنی شکایتیں، تجاویز، اور تبصرے کارکنان اور رہنماؤں کے سامنے رکھے، سب سے آخر میں کراچی پارٹی کے صدر کامریڈ جمیل شاہد نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور کہا ایسی تقریبات کا مقصد سیاسی کارکنان کی عملی تربیت، انکی باہم ملاقاتیں اور پارٹی کے کام دوران پیش آنے والے مختلف مسائل کے حل ڈھونڈنا ہوتا ہے، جناب صدر کی تقریر کے بعد شرکاء کی چائے سے تواضع کی گئی۔

اپیل

عوامی ورکرز پارٹی کے تمام وفاقی، صوبائی اور ذمہ داروں سے اپیل ہے کہ وہ اپنے اپنے صوبوں اور ضلعوں میں پارٹی سرگرمیوں کی رپورٹس اور تصاویر عوامی جمہوریت کے پتے پر ارسال کریں۔

۱۹۱۷ کے انقلاب اکتوبر کے ادب پر اثرات

مسلم شمیم

☆☆☆

انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ کا صد سالہ دورِ تاریخ عالم میں عمومی اور عالمی ادب کی تاریخ میں خصوصی طور پر غیر معمولی اثرات کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ادب کا عالمی منظر نامہ انقلاب کے حوالے سے تمام اصناف ادب میں ایک نئی کہکشاں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کا ظہور پذیر ہونا پہلا بورژوا انقلاب تھا۔ اِس انقلاب کا نعرہ یعنی آزادی مساوات اور اخوت (LIBERTY, EQUALITY & FRATERNITY) انیسویں صدی میں پورے یورپ میں مختلف عشروں میں گونجتا رہا اور دور رس انقلاب آفریں تحریکیں اور معرکہ آرائیاں مختلف یورپی ممالک میں وقوع پذیر ہوتی رہیں۔ انقلابِ فرانس کا بورژوا انقلاب فرانس میں بادشاہت کے خاتمے پر منتج ہوا تھا، مگر ایک عشرے کے بعد ہی ۱۷۹۹ء میں نپولین بونا پارٹ نے اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر کے وقتی طور پر اس بورژوا جمہوری انقلاب کی نفی کی، مگر یہ عرصۂ انہدامِ جمہوریت زیادہ دیر قائم نہیں اور انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء کا آدرش مختلف روپ دھارتا اور یورپ کے معاشرے پر اپنے اثرات مرتب کرتا رہا اور ۱۸۷۰ء میں پیرس کمیون گو بہت قلیل عرصے کا انقلاب وقوع پذیر ہوا تھا، مگر یہ تجربہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں انقلابِ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے روپ میں بھرپور طور پر تاریخِ عالم میں ایک نئے عہد کا شاخسانہ ثابت ہوا۔ یہاں یہ بیان معنویت کا حامل ہے کہ انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء کے سال ہی میں امریکا میں پہلا بورژوا جمہوریت کا آئین تدوین پذیر ہوا، اور اس طرح جاگیرداری معاشرہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں تبدیل ہوا اور یہ تبدیلی مختلف مرحلوں میں کرۂ ارض کے ممالک میں مختلف رنگ و روپ کے ساتھ نظر آتی گئی۔

موضوعِ زیرِ بحث یعنی انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء کے ادب پر اثرات پر براہ راست گفتگو سے پہلے پر ابتدائیہ یعنی جملہ ہائے معترضہ انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء یعنی سوشلسٹ انقلاب کے ظہور ہونے کا تاریخی تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی غرض پیش کیے گئے ہیں۔

انقلاب اکتوبر یعنی روسی اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ کا تاریخ ساز واقعہ صرف روس کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ یعنی انقلاب نہ تھا بلکہ تاریخِ عالم کا سب سے اہم اور عظیم ترین واقعہ تھا جس نے بیسویں صدی کو عالمی تاریخ میں سب سے اہم صدی بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اِس انقلاب کے دور رس اور ہمہ گیر اثرات کرۂ ارض کے چپے چپے پر مرتب ہوئے۔ یہ انقلاب اس سے پہلے ظہور پذیر ہونے والے انقلابات سے یکسر مختلف تھا۔ یہ انقلاب نہ تو کسی سازش کا نتیجہ تھا اور نہ کسی فوجی بغاوت (COUP DEDAT) شاخسانہ تھا۔ یہ انقلاب سماج میں عالمی سطح پر ہونے والے ارتقائی سفر کے اہم موڑ کے طور پر ظہور پذیر ہوا۔ یہ ایک نظریاتی انقلاب تھا یعنی کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کے نظریہ اشتراکیت یعنی سائنٹفک سوشلزم کا عملی روپ۔ اس انقلاب کی نوید ۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ مینی فسٹو کے ذریعے دی گئی تھی جس کے خالق اور مصنفین کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز تھے۔ مذکورہ کمیونسٹ مینی فسٹو کے ابتدائیے میں اس انقلاب کی جن پرزور اور پرشور الفاظ میں بشارت دی گئی تھی، وہ الفاظ یہ تھے:

> ''ایک آسیب یورپ میں منڈلائے پھر رہا ہے، کمیونزم کا آسیب
> اُس کو دفع کرنے کے لیے پرانے یورپ کی تمام طاقتیں ایک مقدس
> اتحاد میں شامل ہوگئی ہیں''

انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء کا اشتراکی انقلاب جہانِ سیاست ومعیشت کا اہم ترین انقلاب ہونے کے ساتھ جہانِ فکر و شعور اور دنیائے ادب میں انقلابی دھاروں اور ہمہ جہت اثرات کا حامل انقلاب بھی تھا۔ دنیائے ادب میں نئے دور اور نئے امکانات کی تاریخ مذکورہ انقلاب سے موسوم ہے۔ عالمی ادب میں اس انقلاب نے تخلیقی سطح پر جو کامرانیاں حاصل کی ہیں، وہ بیسویں صدی کی تمام اصنافِ ادب میں دیکھی جاسکتی ہیں، خصوصیت کے ساتھ برِصغیر کی مختلف زبانوں کی شاعری میں اس انقلاب کے نقوش روشن و تابندہ ہیں۔ فکشن اور تنقید و تحقیق میں مارکسی نظریئے کی کارفرمائیاں اور جلوہ سامانیاں صاحبانِ نقد و نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اردو شاعری اور دیگر اصنافِ سخن میں خصوصیت کے ساتھ ہیئت اور مواد (FORM AND CONTENT) ہر دو اعتبار سے انقلابی پیش رفت ہوئی ہے۔ برِصغیر کی سب سے بڑی ادبی تحریک یعنی ترقی پسند تحریک جو بین الاقوامی ترقی پسند تحریک کے ایک حصے کے طور پر ظہور پذیر ہوئی، وہ براہ راست انقلاب اکتوبر کے زیرِ اثر ابھری تھی اور فضائے ادب پر چھا گئی تھی۔

انقلاب اکتوبر کا نظریاتی سرچشمہ مارکسزم تھا اور ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے اشتراکی انقلاب کو باضابطہ منشور کی صورت میں ۱۸۴۷ء میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا جس کی بنیاد ۱۸۴۷ء میں لندن میں منعقدہ یورپ کے اشتراکیت پسندوں کی مختلف بین الاقوامی کمیٹیوں کے مندوبین نے رکھی تھی جس کی کمیٹیاں یورپ کے مختلف مقامات پر کام کرتی تھیں۔ یہ کمیونسٹ لیگ درحقیقت مزدوروں کے ایسے چھوٹے چھوٹے انقلابی جتھوں کا ایک اتحاد تھی جو ایک مقصد اور ایک قیادت کے تحت منظم ہوگئے تھے۔ اس کی جمہوری تنظیم اور انقلابی نظریئے کی بنیاد استوار کرنے میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ کمیونسٹ لیگ کا بنیادی مقصد بورژوازی کی شکست پر پرولتاریا کی حکمرانی، طبقاتی مخالفتوں پر

پنے پرانے بورژوا سماج کا خاتمہ طبقوں اور نجی ملکیت کے بغیر ایک نئے سماج کا قیام تھا۔ بقولِ سید سبطِ حسن:

> ''کمیونسٹ مینی فسٹو فقط نظریاتی منشور ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے محنت کاروں کا رزم نامہ بھی ہے۔ اس کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا مزدوروں کا لشکرِ فتح کا انقلابی نشان اٹھائے دشمن کو للکار رہا ہے کہ بزدلو سامنے آو، اور اگر تم میں اخلاقی جرأت کی رمق باقی ہے تو ہمارے اس رجز کا جواب دو''

مذکورہ بیان سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اشتراکیت کی تحریک روزِ اول سے یک بین الاقوامی تحریک تھی اور اس کے مقاصد بہت واضح تھے جو انسانی سماج میں ایسی بنیادی تبدیلیوں پر استوار تھے جن کی منزل سماج میں اس نظام کا خاتمہ تھا جس کی بنیاد انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال، نابرابری اور سماجی ناانصافی پر قائم کی گئی تھیں۔ ہزاروں سال سے ظالم اور مظلوم طبقات ایک دوسرے سے مختلف ادوار میں برسرِ پیکار رہے ہیں۔ کمیونسٹ مینی فسٹو کے مطابق سارے سماج کی تاریخ جو اس وقت تک قائم ہے، طبقاتی کش مکش کی تاریخ ہے۔ مختصر یہ کہ چیرہ دست اور زیردست ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو کر کبھی کھلی اور ایک بے روک لڑائی لڑتے رہے، ایک لڑائی جو ہر بار پورے سماج کی ایک انقلابی تعمیر پر ختم ہوئی یا لڑنے والے طبقوں کی مشترکہ تباہی پر جدید بورژوا سماج نے جو جاگیرداری سماج سے اٹھا ہے، طبقاتی مخالفتوں کو دور نہیں کیا ہے۔ اس نے محض پرانے طبقوں کی جگہ نئے طبقے، جبر کی پرانے حالات کی جگہ نئے حالات، کش مکش کی پرانی صورتوں کی جگہ نئی صورتیں قائم کر دی ہیں۔ ترقی پسند ادبی تحریک مذکورہ بین الاقوامی اشتراکی تحریک سے بالیدگی حاصل کرتی ہوتی ہوئی اسی آدرش کے لیے کام کرتی آئی ہے۔

ترقی پسندیت اور ترقی پسند تحریک کی کہانی سماجی ارتقا کی کہانی کا جزوِ لاینفک ہے۔ سماجی زندگی کے آغازِ سفر ہی سے اس کہانی کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ انسان جنگل اور غاروں سے نکل کر جب کھیتی باڑی کے دور میں آیا اور ایک عرصۂ دراز تک کلی طور پر اجتماعی زندگی یعنی ابتدائی اشتراکیت (PREMITIVE COMMUNISM) کے عہد میں رہا اور یہ عرصہ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اس سماجی عمل میں جب نجی ملکیت نے جنم لیا تو غیر طبقاتی سماج طبقاتی سماج میں بدل گیا اور یہیں سے طبقاتی کش مکش اور آویزش کا سلسلہ شروع ہوا۔ طبقاتی کش مکش کی تاریخ در اصل سماج میں ترقی پسند قوتوں اور رجعت پسند قوتوں کے درمیان کش مکش، آویزش اور جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اِس کو معرکۂ خیر و شر بھی سمجھنا چاہیے۔ اس معرکۂ خیر و شر سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سماج سفرِ ارتقا پر گامزن ہے۔ سماجی ارتقا تغیر و ترقی اور انقلابات سے دوچار ہوتا ہوا قانونِ فطرت کی عمل داری میں سرخروئی کی منزلوں سے ہم کنار ہوتا آیا ہے۔ تاریخی مادیت کا یہ شعور اور ادراک مارکسزم کی دین ہے جس کا براہِ راست انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء سے متاثر ادب میں مختلف روپ اور مختلف اصناف ادب میں اظہار کیا گیا۔ اس سماجی شعور اور ادراک کا حامل ادب بڑا ادب شمار کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں اس کے اثرات سب سے نمایاں طور پر فنکشن میں نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ابتداء ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ کانفرنس سے ہوئی اور اس کے بعد کا عشرہ گویا ادبی دنیا میں انقلابی عشرے کا درجہ رکھتا ہے۔ ادب کے سماجی کردار کا بھرپور ادراک اور اظہار ترقی پسند تحریک کا سب سے روشن پہلو ہے اور سماج کی تبدیلی میں ادب کے کردار کو جس غیر مبہم انداز میں پیش کیا گیا، یہ ترقی پسند تحریک کا طرۂ امتیاز ٹھہرتا ہے۔ اس عہد سے پہلے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے درمیان بحث و تمحیص ہوتی رہی تھی۔ یہ بحث ادب کے سماجی کردار اور خود ادب کی تخلیق کو سماجی عمل قرار دے کر گویا اپنے منطقی نقطۂ نظر پر اختتام پذیر ہوگئی۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ انقلابِ اکتوبر ۱۹۱۷ء ایک عالمی تاریخ ساز واقعہ تھا جس کے مثبت اور منفی تمام شعبہ ہائے حیات پر مرتب ہوئے۔ جہانِ فکر و دانش اور ادب کے شعبے میں غیر معمولی اثرات سامنے آئے، فسطائیت اور بنیاد پرستی کے رد میں دنیا بھر کی زبانوں کے ادب میں نظریاتی مباحث ہوئے، جنگ کے خلاف اور امن کے حق میں بہترین اور مؤثر ترین تخلیقات عالمی ادب کی تاریخ کا حصہ بنیں۔ طوالت کے پیشِ نظر مثالیں پیش نہیں کی جا رہی ہیں۔ ترقی پسندیت اور اشتراکیت کا چولی دامن کا ساتھ رہا جو کچھ حلقوں کے نزدیک ادب کے جمالیاتی تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا، مگر یہ حلقے بھی انقلابِ اکتوبر کے ہمہ گیر اثرات سے بے بہرہ نہیں رہے اور ان کی تخلیقات میں سماجی شعور کا اظہار براہِ راست ترقی پسندیت کی دین ہے۔ یہ بات بھی کہی جانی چاہیے کہ دنیا کو تبدیل کرنے کا مارکسی فلسفہ اس وقت تک ہمارے لیے معنویت کا حامل رہے گا جب تک انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال، جبر و جور اور عدمِ مساوات کی عمل داری قائم رہے گی۔ دنیا کو دیکھنے کا خواب ہمارے آدرش اور ہماری تخلیقیت کا سرچشمہ رہے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ خواب کلیتہً کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا اور انسان کا انسان کے ہاتھوں استحصال کسی نہ کسی روپ میں جاری رہے گا، مگر ہم اپنے اس خواب کو اپنی حیثیت اور طرزِ احساس اور تخلیقیت کے جذبے سے جدا نہیں کر سکتے۔ ترقی پسند تحریک اور نظریہ اس خواب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

(بقیہ کراچی سیمینار)

انہوں نے کہا کہ زراعت کے طریقہ پیداوار میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے مگر اس کے ثمرات ہاریوں تک نہیں پہنچ رہے ہیں آج بھی وہ غربت میں اپنی زندگی گذار رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کے سینئر تاج حیدر نے کہا کہ کسانوں کے حقوق بڑے پیمانے پر عوام میں آگاہی پیدا کئے گئے بغیر ناممکن ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان چند ممالک میں سے ایک ہے جہاں اب تک غیر حاضر زمین دار اپنے گھروں میں بیٹھ کر کسانوں کی محنت مشقت سے حاصل کی ہوئی دولت پر عیش کر رہے ہیں۔ عوامی ورکرز پارٹی کے سینئر نائب صدر یوسف مستی خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بنیادی عوامی مسائل، زرعی اصلاحات اور دہشت گردی کے خاتمے پر مبنی نکات پر آپ ترقی پسندوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا سکتے ہیں اور آپ کو ایسا کرنا ہی ہوگا۔ انہوں نے مزید کہا کہ زرعی اصلاحات کے سلسلے میں منوں صاحب اور اختر حسین ایڈوکیٹ سے مشاورت جاری رہے گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ عوامی ورکرز پارٹی کی قیادت کو بھی وفد کی صورت میں مختلف پارٹیوں سے اس سلسلے میں ملاقات کرنی چاہیے۔ آخر میں سیمینار کے صدر اور پارٹی کے سینئر نائب صدر یوسف مستی خان نے مقررین کی آراء سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اے ڈبلیو پی عوام کے بنیادی حقوق کے حصول کی جدوجہد کے لئے مشترکہ پلیٹ مہیا کرتی رہے گی ہم مشترکہ جدوجہد سے جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ کر کے حقیقی جمہوریت نافذ کریں گے۔

چراغ آندھی میں جل رہا ھے

صباالدین صبا

☆☆☆

جاگیردارانہ نظام اور امریکی سامراج کے خلاف کمیونسٹ پارٹی آف فلپائن کی جدوجہد نصف صدی پر محیط ہے۔ ہر قسم کے حالات کے متعلق حکمت عملی اختیار کر کے اپنی جدوجہد کو جاری رکھتے اور آگے بڑھاتے اس انقلابی جماعت نے نہایت حوصلہ افزاء مثال قائم کی ہے۔

1950ء کی دہائی میں فلپائنی کمیونسٹ پارٹی (PKP) نے فلپائنی حکمرانوں کو بڑھتی ہوئی کرپشن، ناقص پالیسیوں اور سامراجی بالادستی کے خلاف عوام نے بڑی مزاحمتی تحریک چلائی۔ لیکن پارٹی میں موجود ترمیم پسندانہ اور مصلحت پسندی کے رجحانات نے عوامی ابھار کو منظم شکل نہ دیا اور اسے سیاسی قوت میں تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

پارٹی میں موجود حقیقی انقلابیوں نے اس صورتحال کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کیا۔ اور 1960ء کی دہائی میں پارٹی کے فیصلے کے مطابق ایک انقلابی ساتھی جوز ماریہ سیئن نے جائزہ رپورٹ تیار کی جس میں پارٹی قیادت میں کڑی نکتہ چینی کی گئی۔ پارٹی کے اس وقت کے سیکریٹری جنرل جیسس لاوا کو ترمیم پسند اور انقلاب دشمن قورار دیا گیا۔ جس کے بعد 26 دسمبر 1968ء کو پارٹی کے از سر نو قیام کی کانگریس منعقد ہوئی جس نے ایک دستاویز جاری کی جس کا عنوان تھا

Rectify errors and rebuild the party

غلطیوں کی اصلاح اور پارٹی کی از سرِ نو تعمیر۔

اس طرح 26 دسمبر 1968 کو موجودہ کمیونسٹ پارٹی آف فلپائن کا قیام عمل میں آیا۔ روز اول سے پارٹی کے قیام اور تنظیم کاری میں ممتاز دانشور جوز ماریہ سیئن کو کلیدی اہمیت حاصل رہی جو اس وقت پارٹی کے چیئرمین ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی آف فلپائن مارکزم لیننن ازم ماؤازم کو اپنی فکری اساس قرار دیتی ہے۔ تاہم جوز ماریہ سیئن کی نگاہ میں ماؤازم اور فکر ماؤزے تنگ میں کوئی فرق نہیں۔ وہ مارکزم اور لیننن ازم کے داعی ہیں اور انہوں نے کبھی ان عناصر کا ساتھ نہیں دیا جو ماؤ کی تعلیمات کو لیننن اور اسٹالن سے الگ کردیتے ہیں۔ وہ کسی بھی ملک کے مخصوص حالات کے مطابق فکر کے تخلیقی اطلاع پر نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ عملی طور پر جوز ماریہ اس کے لیئے کوشاں رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فلپائن کی مخصوص صورتحال میں اس میں ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ اپنی حکمت عملی میں ہمیشہ کھلے دل کے ساتھ ردوبدل کیا۔ البتہ عقیدہ پرست، لن بیاؤ اسٹ عناصر کو ان کا یہ رجحان کبھی نہ بھایا۔

الٹرالیفٹ رجحان کے علمبردار عناصر نے 1976 میں ماؤ کے انتقال کے بعد فوری پر ریوولوشنری انٹرنیشنلسٹ موومنٹ بنائی تو فلپائن کی پارٹی نے اس میں شمولیت سے گریز کیا۔

RIM نے 1987 میں فلپائن کی کمیونسٹ پارٹی کے نام اپنے ایک کھلے خط میں اپنی بائیں بازو کی انتہائی پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سی پی پی پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس سے قبل سی پی پی نے خود تنقیدی کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے ان انتخابات کے بائیکاٹ کو اپنی غلطی قرار دیا تھا جس کے نتیجے میں فلپائن میں مارکوس کا اقتدار ختم ہو گیا رم نے خود تنقیدی کے اس دستاویز پر نکتہ چینی کی اور فلپائنی پارٹی پر موقع پرستی کا الزام لگاتے ہوئے اسکی جلد تحلیل کی پیشگوئی کردی۔ لیکن وقت نے دائیں بازو کے انتہا پسندی کو ایک بار پھر غلط اور کمیونسٹ پارٹی آف فلپائن اور خاص طور سے اسکا فائدہ جوز ماریہ سیئن کی سیاسی بصیرت، مارکس لینن نظریے کو زمینی حقائق پر تخلیقی اطلاع کے اصول کی صداقت کو ثابت کیا۔ سی پی پی کے تحلیل ہوجانے کا اندیشہ تو بہت دور کی بات ہے ہر آنے والے دن کے ساتھ پارٹی زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی گئی اور فلپائن کی سیاسی صورتحال میں اس کردار روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ بین الاوامی سطح پر آج بھی امریکی سامراج اس پارٹی کو خطرناک مزاحمت کاروں میں شمار کرتا ہے۔ سی پی پی نے مختلف ادوار میں جمہوری اور عوامی مقبولیت کی حامل قوتوں کے ساتھ باوقار اتحاد قائم کیا۔ اور تنظیم کی بڑھوتری کے لیئے حالات میں موجود مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ایک انقلابی تنظیم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ہدف کی طرف بڑھتے ہوئے عوام کے نقصان کو کم سے کم کرے اور اس پر توجہ دیں، فلپائن کی کمیونسٹ پارٹی کے جدوجہد کی ہر شکل اختیار کی اور عوام کی طاقت پر اپنا اعتماد کبھی متزلزل نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ہی پارٹی نے اپنی انقلابی قوت کو کبھی کسی مفاہمت پسندی کا شکار بھی ہونے نہیں دیا۔ پارتی کے لسم ونت نیو پیپلز آرمی (NPA) اور سیاسی محاذ نیشنل ڈیموکریٹک پرنٹ فعال اور مربوط طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دیتا رہا فلپائن کے صدر اکینو اور اسکے بعد آنے والی حکومتوں میں پارٹی حکومت مذاکرات جاری رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ NPA کی قوت اور کارروائیوں میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔

کمیونسٹ پارٹی آف فلپائن کے سربراہ ممتاز ماؤ نواز کمیونسٹ دانشور پروفیسر جوز ماریہ سیئن (Pr. Jose Masia Sison) تین دہائیوں کی جلاوطنی گزارنے کے بعد فلپائن جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ فلپائن کے نومنتخب صدر روڈ ریگو ڈوٹرٹے نے ان اطلاعات کا خیر مقدم کیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ پروفیسر جوز مایہ سیسن جلد وطن لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ڈوٹرٹے متعدد بار اعلان کر چکے ہیں کہ وہ فلپائن میں حکومت اور نیو پیپلز آرمی کے درمیان 1968 سے جاری جنگ کے خاتمے میں سنجیدہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس جنگ میں ایک اندازے کے مطابق اب تک 40000 سے زائد افراد مارے جا چکے ہیں۔ ڈھرٹے جو پروفیسر

جوز ماریہ سیسن کے فلپائن یونیورسٹی میں شاگرد رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ کمیونسٹ رہنماؤں کی وطن واپسی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

صدر ڈوٹرٹے نے پہلے ان کابینہ میں تین افراد کو شامل کر رکھا ہے جنہیں عام طور پر کیمونسٹ کہا جاتا ہے۔ صدر ڈوٹرٹے کا کہنا ہے کہ وہ کیمونسٹ نہیں سوشلسٹ ہیں۔ لیکن کیمونسٹ کے ساتھ طویل خانہ جنگی کے خاتمے کے لئے مذاکرات کے حق میں ہیں کیونکہ اس جنگ کے جاری رہنے سے ترقیاتی عمل بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ صدر ڈومیرٹے کی کابینہ میں تین ارکان نیشنل ڈیم کریٹک فرنٹ کے نامزد کردہ ہیں۔ ان تینوں کے پاس زرعی اصلاحات، سماجی بہبود و ترقی اور انسداد غربت کمیشن کے قلمدان ہیں۔

ڈوٹرٹے نے تین ماہ قبل صدر کا عہدہ سنبھالنے سے قبل ایک پریس کانفرنس میں ان اطلاعات کا خیر مقدم کیا تھا کہ کیمونسٹ رہنما جوز ماریہ سیسن 30 سال کی جلاوطنی کے بعد وطن واپس آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جوز ماریہ سیسن نے ٹیلی فون پر رابطہ کر کے انہیں صدارتی انتخابات جیتنے مبارکباد دی تھی اور کہا تھا کہ ڈوٹرٹے کیمونسٹ مزاحمت کاروں کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں، اور وہ ان کے صدر بننے کے بعد کیمونسٹ پارٹی اور حکومت کے مذاکرات دوبارہ شروع ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔

ڈوٹرٹے حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے حکومت اور کیمونسٹوں کے درمیان مذاکرات کا از سر نو آغاز ہو گیا ہے۔ ڈوٹر سمجھتے ہیں کہ فلپائن میں کیمونسٹوں اور مسلم علیحدگی پسندوں کے درمیان جنگ ختم کرنا ضروری ہے۔ جسکی وجہ سے اقتصادی ترقی متاثر ہو رہی ہے۔ صدر کی ہدایت پر 18 کیمونسٹ گوریلا رہنماؤں کی جیل سے رہائی کے بعد کیمونسٹوں اور حکومت کے درمیان مذاکرات کا راستہ بحال ہوا ہے۔ مذاکرات میں کیمونسٹوں کے تین بنیادی مطالبات پر گفتگو ہو رہی ہے جن میں زرعی اصلاحات، اہم اقتصادی شعبوں کو قومیانہ، امریکہ کے فوجی اور اقتصادی اثرات کی طرف بڑھنے کیلئے زرعی اصلاحات، سماجی بہبود اور انسداد غربت کمیشن کی وزارتیں پہلے ہی نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کے نامزد تین وزراء کے حوالے کر رکھی ہیں، فلپائن کے ایک شہر ماراوئی اور بعض دیگر علاقوں میں داعش جنگجوؤں کی مداخلت اور ماوئے گروپ، ابوسیاف اور دیگر دہشت گردوں کی سرگرمیاں غیر معمولی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ اور حکومت کے لئے ان سے نمٹنا ضروری ہو گیا ہے۔

فلپائنی حکومت اور کیمونسٹوں کے درمیان مذاکرات میں حکومتی ٹیم کے سربراہ اور وزیر محنت سلولیسٹرا بیلو (Silvertra Bello) نے کہا ہے کہ فلپائن حکومت دہشتگردوں کے خلاف جنگ میں کیمونسٹوں کی شمولیت کی خیر مقدم کرتی ہے نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کا کہنا ہے کہ اگر حکومت کے ساتھ معاہدہ ہو جائے تو ماراوئی اور کاٹاپائی میں نیو پیپلز آرمی کی تعیناتی عمل میں لائی جائے گی۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق این ڈی ایف نے اعلان کیا ہے کہ دہشتگردوں کے خلاف کارروائی کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کیلئے این پی اے اور ماراوئی اور متاثرہ علاقوں میں سرکاری فورسز پر حملے کرنے سے گریز کرے۔ این ڈی ایف کے اس بیان کے جواب میں فلپائنی حکومت نے منڈاناؤ میں کیمونسٹوں کے ساتھ باہمی اتفاق سے تیار کردہ دو طرفہ جنگ بندی معاہدے پر دستخط اور سماجی و اقتصادی اصلاحات، سیاسی و آئینی اصلاحات، سیاسی و آئینی اصلاحات اور دیرپا امن کیلئے سمجھوتوں تک پہنچنا چاہتی ہے۔ پیپلز وار کی حکمت عملی کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو پارٹی قیادت کے دانشمندانہ فیصلوں اور این پی اے کی بہترین کارکردگی کے نتیجے میں سی پی پی اسٹریٹیجک ڈیفنس سے آگے نکل کر اسٹریٹیجک اسٹیل میٹ کے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے اور جوز ماریہ سیسن جس کامیابی سے توازن کے ساتھ سیاسی حکمت عملی کو آگے بڑھا رہے ہیں اگر یہ اسی طرح جاری رہا تو سی پی پی جلد ہی فلپائن میں ایک مخلوط حکومت تشکیل دے سکتی ہے۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ سی پی پی نے عوامی محاذ این ڈی ایف اور مسلم ونگ این پی اے کے ساتھ اس پوزیشن میں آگئی ہے کہ وہ فلپائن میں عوامی جمہوری انقلاب کے قریب کھڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے ساتھ برابری کی بنیاد پر مذاکرات کے ذریعہ بہتر سے بہتر پوزیشن اختیار کرنے کیلئے کوشاں ہے۔ یقیناً فلپائن میں کیمونسٹ پارٹی کی ہر کامیابی دنیا بھر کے محنت کش عوام اور بائیں بازو کے کارکنوں کیلئے مسرت، اعتماد اور حوصلے کی باعث ہے۔

☆☆☆

عوامی ورکرز پارٹی گذری کراچی یونٹ کی رپورٹ

عوامی ورکرز پارٹی ڈیفنس، گذری میں سرگرم پارٹی کارکنوں کا ایک اجلاس معروف دانشور، پارٹی کے معتبر رہنما کامریڈ اے۔ آر۔ عارف کی صدارت میں ڈیفنس میں واقع اُن کی رہائش گاہ پر مورخہ 16 جولائی 2017 کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ پارٹی کے سینئر رہنماؤں، سیکریٹری کراچی شفیع شیخ، سینئر نائب صدر کامریڈ جمیل شاہد ایڈوکیٹ، ڈپٹی سیکریٹری کامریڈ مامون چوہدری، یوتھ کے سیکریٹری مختار راہو ایڈوکیٹ کے علاوہ نوجوانوں کی ایک خاصی تعداد نے شرکت کی۔ اجلاس میں شریک تمام ساتھیوں کے تعارف کے بعد عوامی ورکرز پارٹی کے اس یونٹ کا نام ڈیفنس گذری یونٹ رکھا گیا اور کامریڈ محمد خان سولنگی کو متفقہ طور پر سیکریٹری منتخب کیا گیا۔

اجلاس میں تنظیمی صورتحال کا جائزہ لینے کے علاوہ آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کیا گیا۔ یونٹ کے لیے متفقہ طور پر تنظیمی کمیٹی تشکیل دی گئی، جن میں کامریڈ منیبہ، سینئر کامریڈ حاجرہ، کامریڈ فاروق راہو، کامریڈ بابر، کامریڈ مختار راہو اور کامریڈ اسد بلال شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے کیا گیا کہ از روئے آئین یونٹ کا اجلاس ہر ماہ ایک بار لازمی طور پر منعقد ہو گا، جس کے لیے ممکنہ تاریخ مہینے کے آخری اتوار سے قبل پارٹی یونٹ کی تنظیمی کمیٹی طے کرے گی۔ اجلاس میں کامریڈ منظور رضی، کامریڈ روڈائنہ، کامریڈ ابراہیم ابڑو، کامریڈ شوکت حیات، کامریڈ عتیق الرحمٰن اور کامریڈ رسول بخش سمیت معروف مزدور رہنما کامریڈ کنیز فاطمہ جو کہ ڈیفنس گذری کے علاقے کی مکین ہیں، بوجوہ شرکت نہ کر سکے۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اگلی میٹنگ میں پارٹی کارکن اور لیڈران جو میٹنگ میں نہیں آسکے تھے ان کی شرکت کو یقینی بنایا جائے۔

☆☆☆

سیاست کیوں کی جائے

گلزار چنا

"اگر آپ سیاست میں حصہ نہیں لیں گے تو آپ پر جاہل لوگ حکومت کرینگے"۔

مذکورہ الفاظ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل یونان کے فلاسفر افلاطون نے کیے تھے جس سے سیاست کی اہمیت کا پتا چلتا ہے کہ سیاست ہماری زندگی سے کتنا قریب تعلق رکھتی ہے۔

یونان کا ہی دوسرا فلسفی ارسطو نے تو اس حد تک کہا تھا کہ جو شخص سیاسی نہیں وہ مہذب ہو ہی نہیں سکتا۔ جو شخص معاشرے کے اجتماعی مفادوں اور اس کے تحفظ کے عمل کا شعور نہیں رکھتا وہ سیاسی نہیں ہو سکتا اور جو شخص سیاسی نہیں وہ مہذب نہیں ہو سکتا کیونکہ صرف مادی مفادوں کا تحفظ جانور بھی کرتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ سیاست کو بہتر عمل سمجھتے ہیں ان کی نیت نیک ہوتی ہیں وہ عملی سیاست میں حصہ لینا چاہتے ہیں لیکن موجود سیاسی جماعتوں پر اعتراضات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ سب کام کی نہیں ہیں چنانچہ اس میں شامل ہو کر سیاست کرنا صرف اپنا قیمتی وقت ضائع ہی کرنا ہے۔ اس سے اچھا ہے اپنے گھر کو وقت دیا جائے۔ چنانچہ آج کے دور میں گھر چلانا ہی بڑا جہاد ہیں۔ اس طرح سیاسی جماعتوں میں سینکڑوں عیب انہیں نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ سیاسی جماعتوں کے لیڈراں پر بھی اعتراضات کرتے نظر آتے ہیں۔ فلاں کے سوئس اکاؤنٹ میں اتنے پیسے پڑے ہیں، فلاں لیڈر کے پاس پاناما میں آف شور کمپنیاں ہیں۔ ایسے کہہ کر خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ خود کو تسلی دینے یا اپنی بے عملی کا جواز پیدا کرنے کیلئے وہ کہتے ہیں جب کوئی صاف ستھری قیادت آئی تب وہ سیاست میں حصہ لینگے فی الحال صبر و شکر کا مظاہرہ کرتے بس اپنے بچوں کی روزی وروٹی کا انتظام کرتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو سیاست کو رات دن برا کہتے نہیں تھکتے۔ وہ اس خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ ان کا دامن سیاست سے پاک ہے اس کا دوسرا مقصد یہ ہوا کہ ایسے لوگوں کی نظر میں سیاست ایک گندا کھیل ہے جو شخص اس کے قریب جاتا ہے وہ خود کو گندا کر دیتا ہے۔ اس قسم کی باتیں وہ اپنے بچوں سے بھی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اولاد کو طلبہ سیاست کرنے سے منع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس بات پر توجہ دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے کہ حکومتی فیصلے ان پر کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حکومت جب تیل کے نرخ میں اضافہ کرتی ہے تو اس سے وہ شخص بھی متاثر ہوتا ہے جو سیاست سے قریب سے تعلق رکھتا ہے اور وہ بھی جو سیاست سے ڈرتا ہو۔

ہمارے حکمرانوں کے اثاثوں کو دیکھ کر بھی عمومی طور سمجھا جاتا ہے کہ سیاست دولتمندوں کا کھیل ہیں۔ وہ غریب غربے کے بس کی بات نہیں ہیں۔ درحقیقت سیاست ریاست اور معاشرے کے نظم وضبط اور طریقہ کار کا علم ہے۔ سیاست کوئی ہمارے نئے زمانے کا منظر نہیں ہے۔

یہ علم تب سے موجود ہے جب سے افراد کے ذریعے ارتقائی تسلسل میں معاشرا بنا تھا۔ آگے چل کر بادشاہت اور جدید ریاستوں کی بنیاد پڑی ہے۔ سیاست کا بنیادی سوال وہ ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے کو کس طرح چلایا جا رہا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کون سے طبقات کے مفادات ایک جیسے ہیں اور کون سے طبقات کے مفادات آپس میں متضاد ہیں۔ اسی طرح عالمی سیاست میں کون سے ملک اتحادی ہیں اور کون سے ملک ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ مطلب ایک گاؤں کی سیاست ہو یا ملک کی، ان کا مقصد ایک جیسا ہوتا ہے۔ سیاست معیشت کے سوال کو حل کرنے، نیز جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ پیداواری وسائل کی تقسیم کس طرح ہو رہی ہے؟ عام آدمی کی زندگی کس طرح گذر رہی ہے؟ کیا عوام کو وہ بنیادی انسانی حقوق مل سکے ہیں؟ جو انسانی تاریخ کی ارتقائی تسلسل میں تسلیم کیئے گئے تھے؟ یا وہ بنیادی حقوق کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ سیاست کا تعلق اس سوال سے بھی ہوتا ہے کہ اپنے معاشرے کو کس طرح خوشحال رکھے؟ اپنے ملک کے شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرنا بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ ریاست کا تمام کام عوام سے وصول ٹیکس کے سہارے چلتا ہے۔ وہ جدا بات ہے کہ ہمارے حکمران طبقات ٹیکس دینے سے آزاد ہوتے ہیں۔ البتہ اس غریب کے بجلی کا کنکشن کاٹا جاتا ہے جس کے گھر میں صرف ایک بلب اور پنکھا ہوتا ہے۔ اب تو بات اس سے بھی آگے نکل گئی ہے، نیب اور دوسرے چھاپا پارٹیوں کے ذریعہ ایسے غریب عوام کو بجلی کی بقایاجات کی بوجھ سے جیلوں میں ڈالا جا رہا ہے۔

سماجی سائنسدانوں کے مطابق کسی مظہر بابت خیالات، موجودہ نظام کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ہمارا سیاسی نظام سرمائدارانہ اور جاگیردارانہ باقیات کا ہے۔ یہ نظام پوری کوشش کرتا ہے کہ سیاست کو اتنا کنفیوز اور مشکل بنا کر دیکھایا جائے جو عام شخص کا سیاست سے یقین ہی نہ رہے۔ حکمران طبقات نسل در نسل حکمرانیکا مزا لوٹتے ہوئے سیاست کو اپنی خاندانی میراث بنالی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ سب کو لازمن عملی سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ کچھ لوگ سیاستدان بنیں گے تو کچھ بیوروکریٹ، ڈاکٹر، انجینئر اور تجارت کے شعبہ جات میں جائیں گے۔ میری کہنے کا مقصد یہ بھی نہیں کہ جو سیاست ہیں وہ ایک عظیم و پاک پوتر چیز ہیں۔ سیاست کے مختلف اندازوں میں بھی فرق کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک سیاست وہ ہوتی ہے جو وڈیرہ اور سرمایہ دار طبقہ کرتا ہیں۔ وہ سیاست عوام کے اجتماعی مفادات کیخلاف ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کو آگے لینے کے بجائے پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ پیداواری اوزاروں کی ترقی اور خیالات کی آزادی میں رکاوٹ بنتے

ہیں۔ جب کہ دوسری عوام دوست و ترقی پسند سیاست ہے جو معاشرے کے مختلف حصوں اور پرتوں کی خوشحالی کیلئے جدوجہد کرتی ہیں۔

بے شک ہماری عوام دوست و ترقی پسند سیاست میں بھی خامیاں اور کمزوریاں رہی ہیں۔ جس کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے باتوں کی وجہ سے بھی عوام دوست سیاست عوام میں اس انداز سے مقبولیت نہیں جس سے اس کو نچلی سطح تک اپنے قدم مضبوط کرنے میں آسانی ہوتی۔ خارجی اسباب اپنی جگہ پر لیکن داخلی کمزوریوں کو بھی مان لینا چاہیے۔ داخلی اسباب میں سے کچھ یہ ہیں، عوام دوست سیاست اصولی طور جاگیردار کلچر کا رد ہیں لیکن عوام دوست و ترقی پسند سیاست کرنے والے دوستوں نے اپنے جماعتوں میں بھی وہی رویہ رائج کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں رواداری اور تنقیدی شعور غائب ہوگیا۔ آہستہ آہستہ وہ جماعتیں عوام سے دور ہوتی گئیں اور دوسرا سیاسی جماعتوں کے کلچر سے بے خبر لوگ اتفاق سے جب سیاسی جماعتوں کے لیڈر بن جاتے ہیں تو وہ جماعت کو اپنی خرافات اور مرضی ومنشا پر چلاتے جماعت کو اپنی جاگیر اور دوسروں ساتھیوں کو فضول مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔ جن کا کام ان کی خدمت چاکری کرنا اور حکم کو من و عن قبول کرنے کے سوائے کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ وہ سنجیدہ اور پڑھے لکھے کارکنوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کو سائیں سائیں کہتے آگے پیچھے پھریں پروٹوکول دیتے رہیں۔ ایسے لیڈران جماعت کا پرچم یا بینر اپنے ہاتھوں میں اٹھانے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر جماعت کے کسی کام میں کسی ساتھی سے کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے تو وہ اس کا حساب کتاب لیتے وقت آقا بن جاتے ہیں جس کو اپنے غلاموں سے ہر طرح کا سلوک کرنے کی اجازت اور حق حاصل ہوتا ہے۔ نتیجتاً اجتماعی کوششوں سے اجتماعی مقصد حاصل کرنے کا کلچر آہستہ آہستہ مٹی ہوتا جاتا ہے۔ اس سے شخصیت پرستی کا بول بالا ہوتا ہے۔ اسے ماحول میں سیاسی تربیت کی اہمیت نہیں رہتی۔ کارکنوں کی تربیت میں سب سے زیادہ اہمیت زبان کی ہوتی ہے۔ جو کسی بھی نئے شخص کیلئے کشش کا سبب بھی بنتی ہے اور اس سے نفرت کا سبب بھی۔ اس سیاسی تربیت میں ساتھ دساتھ وہ بھی شامل ہوتا ہے کہ پارٹی میٹنگ کی کارروائی کیسے چلائی جاتی ہیں۔ جو شخص میٹنگ کی صدارت کرتا ہے، آخر میں وہ بات کرے گا۔ تنظیم کی پریس ریلیز کس طرح بنائی جاتی ہیں؟ یہ تمام معاملات تربیتی نشستوں سے سیکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ ایسا عمل ایک تو جماعت کی صحتمندی کیلئے بہتر ہوتا ہے اور دوسرا اس کیلئے جو سیاسی کلچر سے انجان شخص کو سیاسی معاملات سمجھنے کیلئے بھی آسانی ہوتی ہے۔ ایک وقت ایک سماجی تبدیلی چاہنے والے سیاسی کارکن کو حالات کی سوچ کرتے خود کو ثابت قدم رکھنا ہوتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عوام دوست سیاسی سفر میں نہ صرف اوروں سے تکالیف اور بدسلوکیاں ملتی ہیں پر اپنوں کے ہاتھ ذلیل و خوار ہونے کے امکانات بھی موجود رہتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں میں عموی طور پر نچلی سطح پر لوگوں کے انتخابات کرنے پر دھیان نہیں دیا جاتا اور نچلی سطح کی ذمہ داریوں کی معمولی سمجھنے نظرانداز کیا جاتا ہے۔ ایک حد تک ایسا کرنے کے پیچھے کچھ تنظیمی مجبوریاں بھی لاحق ہوتی ہیں۔ سیاسی جماعتیں سب کیلئے ہوتی ہیں جو اس کے آئین ومنشور سے اتفاق کرتے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ صاف ستھرے کردار کے مالک ہوں۔ ایسے لوگ سیاسی جماعت کا حصہ بن سکتے ہیں چونکہ سیاسی جماعتیں نیچے سے اوپر تک جاتی ہیں۔ لہٰذا بنیاد جوڑنے میں سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ سیاست کرنا دنیا کا ایک مشکل ترین کام ہے۔ ایک بات نوٹ کرنے کی ہے کہ عوام دوست سیاست میں اب تک جو بھی توڑ پھوڑ ہوئی ہے وہ عوام کی جانب سے نہیں ہوئی، بلکہ سیاسی جماعتوں کے لیڈراں کی اناؤں کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ مجموعی طرح عوام مختلف ادوار میں عوام دوست و ترقی پسند جماعتوں کے فیصلے پر چلتے لڑائی کی ہیں، اپنے گھر، بچوں کی قربانیاں بھی دی ہیں۔ وقت کا سلسلہ رکتا نہیں وہ چلتا رہے گا۔ اگر ایماندار شخص مثبت سیاست کا حصہ نہیں بنیں گے تو ہماری حالت وہی رہے گی۔ عالمی دنیا دہشت گرد ملک قرار دینے کی دھمکیاں دی رہی ہیں، ملکی اندرونی صورتحال یہ ہیں جو ہر روز آدمی کا معیار زندگی گر رہا ہے۔ جدید دور میں تعلیم کا شعبہ ہمارے حکمرانوں سے سیدھا نہیں ہو رہا۔ البتہ جب حکومتی شعبہ جات میں ہونے والی کرپشن اور بدانتظامی کی لسٹ جاری ہوتی ہے تو تعلیم کا شعبہ دوسرے یا تیسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ صحت کے مراکز پرائیویٹ کرکے غریبوں سے علاج کا حق بھی چھینا جا رہا ہے۔ ایسے اور دوسرے مسائل کا حل روشن خیال اور ترقی پسند عوامی سیاست میں ہی ہے۔

زرعی اصلاحات ملکی ترقی اور خوشحالی کیلئے ضروری ہے

عوامی ورکرز پارٹی کراچی کی جانب سے منعقدہ سیمینار بعنوان زرعی اصلاحات میں ملکی ترقی و خوش حالی کے لیئے ضروری ہے۔ سینئر تاج حیدر، پروفیسر توصیف احمد سمیت عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی جنرل سیکریٹری اختر حسین ایڈوکیٹ عوامی ورکرز پارٹی کے سیکریٹری برائے زراعت جناب حسن عسکری اور عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے صدر بخشل تھلو نے سیر حاصل بحث کی۔ عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے سیکریٹری جنرل شفیع شیخ نے کہا کہ عوامی ورکرز اپنی پیشرو سیاسی تاریخ کے ساتھ اب تک زرعی اصلاحات اور ہاریوں کے حقوق کے لیئے جدوجہد کرتی چلی آ رہی ہے اور انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایوب خان کی دی ہوئی اصلاحات اور پھر 1972 اور 1977 کی اصلاحات آئیں۔ جو 1990 میں ضیاء الحق کے دور میں قزلباش وفاقی کیس میں شریعت بنچ کی جانب سے غیر اسلامی قرار دی گئیں۔ پروفیسر توصیف احمد نے معاشی اور سماجی ترقی میں زراعت کی اہمیت کو تاریخ میں دیکھتے ہوئے کہا کہ 1917 میں سب سے پہلے سویت یونین میں کسانوں کی اہمیت اور زمین پر ان کی حق ملکیت کو تسلیم کیا گیا۔ اور یہ اتنا بڑا تاریخی کارنامہ تھا جس کے اثرات دیگر ممالک پر مرتب ہوئے خاص طور پر برصغیر میں کسان تحریکیں منظم ہونی شروع ہوئیں۔ عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی جنرل سیکریٹری اختر حسین ایڈوکیٹ نے تفصیل سے مختلف ادوار میں کی جانے والی زرعی اصلاحات کے قانون اور آئینی نکات کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ 1972 اور پھر 1977 کے زرعی اصلاحات سے کچھ بہتر نتائج حاصل ہو سکتے تھے اگر سیاسی پارٹیاں اور ان کے کارکن اپنا موثر کردار ادا کرتے اور اس سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کر سکتے تھے۔ پارٹی کے رہنما حسن عسکری نے زرعی مسائل کو آپریٹو فارمنگ، جنگلات اور شکارگاہوں کی زمین این جی اوز کے کردار اور جاگیردارانہ ذہنیت پر تفصیلی گفتگو کی۔ سندھ پارٹی کے صدر ڈاکٹر بخشل تھلو نے کہا کہ ہاری تحریک سندھ کی اہم تحریکوں میں سے ایک ہے اور اس کا سلسلہ عنایت اللہ شہید سے ملتا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر 15)

سینیٹ کی قائمہ کمیٹی سے

عابد حسن منٹو کی بریفنگ

رپورٹ: فرمان علی

☆☆☆

عوامی ورکرز پارٹی کی طویل جدوجہد اور قانونی جنگ کی گونج اب عدالتی محاذ سے پارلیمنٹ کے ایوانوں تک پہنچ گئی اور طویل عرصہ تک سردخانے کی نذر ہونے کے بعد دوبارہ منظر عام پر آ گئی اور قومی اخبارات وچینل کے ذریعے پھسل گئی۔ جب 15 رجون 2017ء کو پارٹی کے بانی صدر اور مشہور معتبر قانونی وآئینی ماہر جناب عابد حسن منٹو نے پراثر انداز میں اور دلائل وحقائق سے بھرپور تقریر میں سینیٹ کمیٹی کے اراکین کو زرعی اصلاحات کی اہمیت اور اس کی راہ میں رکاوٹوں کو بیان کیا۔

منٹو صاحب جو پارٹی کے خارجہ امور کی کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں کو سینیٹ کی کمیٹی نے مدعو کیا تھا کہ وہ اس مسئلے پر انہیں آگاہی دے۔ اس تحریک کو پیپلز پارٹی کے ایوان بالا کے رکن کریم احمد خواجہ نے پیش کیا تھا چونکہ اگلے سال انتخابات کا سال ٹھہرا ہے اس لئے زرعی اصلاحات جو 90% فیصد پاکستانی عوام کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے اور ہر سیاسی پارٹی اس مسئلے کو انتخابی سیاست کا حصہ بنانا چاہتی ہے۔

منٹو صاحب نے قانونی وآئینی نقطہ نظر سے اس کی اہمیت اور اس کے پاکستانی سیاست وسماج پر پڑنے والے دوررس اثرات سے کمیٹی کے اراکین کو آگاہ کیا اور کہا کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق خود پارلیمان سے ہے اس لئے انہیں اس پر زیادہ سنجیدگی سے سوچنا چاہیے اور اس میں ایک فریق بننا چاہیے کیونکہ زرعی اصلاحات جو کہ ایک جمہوری دور حکومت میں 1977ء میں ایک آئینی ترمیم اور قانون کے ذریعے نافذ کیا گیا تھا گو کہ اس پر صحیح معنوں میں عمل درآمد نہیں ہو سکا پھر بھی اس سے لاکھوں بے زمین کسانوں اور کھیت مزدوروں کو فائدہ پہنچا جسے بعد میں فوجی ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے دور میں اس آئینی شق کو معطل کروایا گیا اور ایک آئین سے ماوراء عدالتی نظام فیڈرل شریعت کورٹ جو کہ سپریم کورٹ کے متوازی کورٹ بنایا گیا تھا کے ذریعے ایک آئینی عذرداری Petition قزلباش ٹرسٹ کے ذریعے غیر اسلامی قرار دے کر معطل کیا گیا۔

انہوں نے کہا کہ سپریم کورٹ کی شریعت اپیلٹ بینچ کا فیصلہ جس کے ذریعے اس آئینی شق Article 253 کو معطل اور غیر موثر (NULLIFY) بنایا گیا ایک غیر آئینی وغیر قانونی اور پارلیمان کے اختیارات پر شب خون مارنا تھا۔ اب یہ پارلیمان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ شریعت بینچ کے اس غیر قانونی فیصلہ کو آئین سے نکال باہر کریں اور زرعی اصلات کی راہ میں حائل رکاوٹ کو دور کریں اور اپنے کھوئے ہوئے حدود اور اختیارات کو دوبارہ واپس حاصل کریں

منٹو صاحب نے اپنے آئینی جنگ کا پس منظر اور تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ورکرز پارٹی جو اب عوامی ورکرز پارٹی کا حصہ ہے نے 2012ء میں دو آئینی Petition آئین کے آرٹیکل Article 184(3) کے تحت سپریم کورٹ میں داخل کئے تھے جس کے تحت عام شہریوں کی بنیادی حقوق بشمول حق زندگی اور انتخابات میں حصہ لینے کے حق کا تحفظ کو یقینی بنایا تھا کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ فرسودہ انتخابی نظام اور سیاسی وسماجی نظام کی موجودگی میں عام درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے شخص کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ آزادانہ اور منصفانہ طریقے سے انتخابات میں حصہ لے سکے کیونکہ موجودہ جاگردارانہ معاشی وسماجی ساخت میں 90% فیصد لوگ اس سے باہر اور محروم رہ جاتے ہیں صرف 12% فیصد اشرافیہ ہر چیز پر قابض ہے اور وہ اپنے مفادات کیلئے اس غیر منصفانہ اور امتیازی نظام سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے استحصالی مفادات کا تحفظ کرتا ہے جو کہ بنیادی انسانی حقوق کی سراسر خلاف ورزی ہے اگرچہ سپریم کورٹ نے ایک درخواست جو کہ انتخابی اصلاحات سے متعلق تھا اس پر فوراً فیصلہ دیا اور ورکرز پارٹی کے موقف کی تائید کی کہ جب تک انتخابی اخراجات میں کمی نہیں کی جاتی یہ انتخابات شفاف اور منصفانہ نہیں ہو سکتے اور الیکشن کمیشن کو ہدایت کیں کہ وہ اس پر قانون سازی کرے لیکن تاحال اس پر قانون سازی نہیں ہو سکی ہے۔

منٹو صاحب نے کہا کہ جو انتخابی اصلاحات اس وقت تک بے معنی رہ سکتے ہیں جب تک موجودہ فرسودہ معاشی سماجی ڈھانچہ کو تبدیل نہیں کیا جائے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ زرعی اصلاحات کے ذریعے اشرافیہ اور بڑے بڑے جاگیرداروں اور فوجی جرنلوں جو ہزاروں ایکٹر کے مالک ہیں کی طاقت کو توڑا جائے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انتخابی اصلاحات کی درخواست پر تو سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا لیکن دوسری درخواست زرعی اصلاحات پر ابھی تک فیصلہ تو دور کی بات سماعت تک نہیں ہوئی اب تک چار چیف جسٹس ریٹائرڈ ہو چکے ہیں ہر ایک نے وعدہ کیا کہ اس کی سماعت کیلئے تاریخ مقرر کریں گے۔ سابق چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے حکم جاری کیا تھا کہ ایک وسیع بینچ روزانہ کی بنیاد پر اس کیس کی سماعت کرے گی لیکن بوجوہ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد آج پانچ سال گذرنے کے باوجود اس کی سماعت کیلئے تاریخ مقرر نہیں ہونے دی جارہی ہے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ نادہندہ بااثر ہاتھ اس کیس کی سماعت کو روک رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک سیاسی جماعت (PTI) جو کہ تبدیلی کے دعوے دار ہے کے ایک سینئر لیڈر شاہ محمود قریشی اس آئینی درخواست کے خلاف ایک

(Respondent) کے طور پر جاگرداروں کی طرف سے فریق ہیں۔

اس میٹنگ میں سینیٹ کمیٹی برائے اطلاعات ونشریات کے چیئرمین کامل علی آغا، سینیٹر تاج حیدر جو کہ کمیٹی کے ممبر تو نہیں ہیں لیکن ان کی دلچسپی و ماہرانہ رائے کی وجہ سے کمیٹی نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس میں حصہ لیں۔ سینیٹر تاج حیدر نے بھرپور انداز میں منتوصاحب کی حمایت کی اور کچھ بین الاقوامی اور تاریخی حقائق بھی پیش کیے۔ انہوں نے فیڈرل لینڈ کمیشن کے افسران جو اس میٹنگ میں موجود تھے سے پوچھا کہ کیا وہ بتاسکتے ہیں کہ کتنے لوگوں کے پاس کتنی زمین ہیں اور خاص طور پر فوجی افسران کے پاس کتنے ایکٹر ہیں اس پر انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ سینیٹر تاج حیدر نے کہا کہ سب سے زیادہ فوجی جنرل زرعی اصلاحات کے مخالف ہیں کیونکہ ہزاروں ایکٹرز مین ان کے قبضے میں ہیں اس لئے ان کو خطرہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ اس کی زد میں آجائیں گے۔

سینیٹر تاج حیدر نے تجویز پیش کیا کہ ایک جامع رپورٹ اس سلسلے میں تیار کر کے ایوان بالا اور سپریم کورٹ میں پیش کرنا چاہیے کہ آیا نیا قانون سازی کی جاسکتی ہے یا شریعت کورٹ کے 1989ء کے فیصلے کو ختم کر کے 1972ء اور 1977ء کے زرعی اصلاحات کا نفاذ کیا جاسکتا ہے۔ سینیٹ کمیٹی کے دیگر اراکین نے شریعت بینچ کے فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں زرعی اصلاحات رک گئی ہیں۔

کمیٹی نے متفقہ طور پر زرعی اصلاحات کی حمایت کیں اور اٹارنی جنرل آف پاکستان اشتراوصاف علی سے پوچھا کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اس پر انہوں نے رائے دی کہ سینیٹ کے اراکین کو سپریم کورٹ میں ایک فریق کے طور پر پیش نہیں ہونا چاہیے اس لئے ایک طرح وہ اپنے اختیارات کو سپریم کورٹ کے سامنے کم کرنے کے مترادف ہونگے۔ پارلیمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ نیا قانون سازی کرسکتی ہے اور FSC کے فیصلے کو نظرانداز کرسکتی ہے اس پر منتوصاحب کا یہ کہنا تھا کہ قزلباش کیس کی موجودگی میں دوسرا قانون بن نہیں سکتا۔ اس لئے سب سے پہلے فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کو ہٹانا ہوگا۔ چاروں صوبوں کے ایڈوکیٹ جنرلز اور ہیڈ کمیشن کے نمائندوں نے بھی اپنا موقف پیش کیا اور کہا کہ پنجاب، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ زرعی اصلاحات کے مخالف ہیں جبکہ سندھ کے نمائندہ نے کہا کہ وہ اصولاً زرعی اصلاحات کے حق میں ہیں لیکن اس Petition کی ٹیکنیکل بنیاد پر مخالف ہیں۔ اس پر سینیٹر تاج حیدر نے کہا کہ سندھ گورنمنٹ زرعی اصلاحات کے حق میں ہے سابق ایڈوکیٹ جنرل سندھ نے صوبائی حکومت سے مشورہ کیئے بغیر سپریم کورٹ میں جواب داخل کیا اس پر اختر حسین ایڈوکیٹ جنرل سیکریٹری عوامی ورکرز پارٹی نے جب مجھ سے رابطہ کیا اور گلہ کیا کہ پیپلز پارٹی جو خود زرعی اصلاحات کی بانی ہے اس کی صوبائی حکومت اس کی مخالفت کررہی ہے اس پر میں نے صوبائی قیادت سے مشورہ کے بعد ایڈوکیٹ جنرل سے باز پرس کی اور انہیں اپنے عہدے سے ہٹایا گیا اور ہم نے ایک دوسرا جواب سپریم کورٹ میں داخل کیا ہے اور زرعی اصلاحات کی حمایت کرتے ہیں۔

سینیٹر خواجہ کریم داد جس نے AWP کے سینیئر نائب صدر یوسف مستی خان صاحب کی کوششوں اور تجویز پر سینیٹ کمیٹی میں تحریک پیش کیا تھا کہ وہ زرعی اصلاحات کے اوپر منتو صاحب سے رہنمائی حاصل کریں اور ان کو سنیں، نے کہا کہ بڑے بڑے جاگروں پر قابض چند گھرانے سیاست پر اور سیاسی پارٹیوں پر بھی قابض ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر زمین کو ضبط کر کے زمین لوگوں میں تقسیم کیا جائے تو اس سے زرعی پیداوار میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے اور خوراک کی کمی دور کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے چین کی مثال دیں کہ وہاں ہر خاندان کو چھوٹے قطعہ زمین دیا گیا ہے تاکہ وہ زمین کے مالک ہوں اور زیادہ سے زیادہ محنت سے زیادہ پیداوار حاصل کریں اس کا زبردست مثبت نتیجہ نکلا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حیدرآباد یونیورسٹی کے چند طلباء نے ایک کنسلٹنسی فرم بنایا ہوا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مشورہ دیتے ہیں کہ کس طرح جدید خطوط پر کاشتکاری کر کے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے یہ بہت کامیاب تجربہ ہے۔

فیڈرل لینڈ کمیشن اور ان کے صوبائی نمائندوں نے زرعی اصلاحات کیلئے حاصل کئے گئے زمین کو مارکیٹ ریٹ پر خریدنے کیلئے قانون سازی کی بات کیں جس پر منتوصاحب نے ان کو سمجھایا کہ زمین کو قیمت پر جاگرداروں سے لے کر تقسیم کرنا زرعی اصلاحات نہیں ہے حکومت کسی ترقیاتی کام یا منصوبہ کیلئے تو پرائیویٹ لوگوں سے زمین خرید سکتی ہے۔ لیکن غریب اور بے زمین کسان زمین خرید ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے ان افسران سے کہا کہ وہ چیزوں کو گڑبڑ نہ کریں اور دنیا بھر کے ممالک میں جہاں بھی زرعی اصلاحات کی گئی ہیں ان کی مثالوں سے ان کو سمجھایا کہ زرعی اصلاحات کا مطلب انگریزوں کے دور میں غیر قانونی طور پر بااثر لوگوں کو جو زمین دی گئیں تھیں انہیں ضبط کر کے مفت تقسیم کرنا چاہیے۔ سینیٹ کمیٹی کے چیئرمین کامل علی آغا اور دیگر اراکین نے منتوصاحب کی تائید کیں اور تمام صوبوں کو اور اٹارنی جنرل اور ایڈوکیٹس جنرل کو حکم دیا کہ وہ ایک مہینے کے اندر اندر جامع رپورٹ کمیٹی کو پیش کریں اور ٹھوس تجاویز دیں کہ کس طرح نیا قانون بنایا جائے اور زرعی اصلاحات پر عملدرآمد کیا جائے۔

سینیٹ کمیٹی کے اراکین نے منتوصاحب کو ان کی طویل سیاسی و قانونی سطح پر جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا اور لاہور سے کمیٹی کی دعوت پر اسلام آباد آکر بریفنگ دینے پر شکریہ ادا کیا۔

اس بریفنگ کو تقریباً تمام قومی اخبارات ڈان، نیوز، نیشن، جنگ نے نمایاں طور پر شائع کیا۔

☆☆☆

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیروں کی فیصلوں کے ادھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

فیض

عوامی ورکرز پارٹی کے اسیر رہنماء غلام دستگیر محبوب کی رہائی

رپورٹ: فرمان علی

انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے لاہور میں عوامی ورکرز پارٹی کے اسیر رہنماء غلام دستگیر محبوب کو باعزت بری کردیا۔ ان کے علاوہ نو(9) دیگر کسان کارکنوں کو بھی تمام الزامات سے بری کرتے ہوئے ان کی رہائی کا حکم دیا۔ جج چوہدری محمد الیاس نے ان کی رہائی کا حکم 8 جولائی کو جاری کیا۔ غلام دستگیر پانچ سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کے پانچ قیمتی سال گزارنے کے بعد بلاآخر 10 رجولائی کو جیل سے رہا ہوئے ان کی رہائی کی خبر سے پارٹی کارکنوں اور بالکل خصوص ڈیرہ سہنگل کے مظلوم کسانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور پارٹی کے اندر ایک نیا حوصلہ اور جذبہ پیدا ہوا۔ 10 جولائی کو شیخوپورہ جیل کے دروازے پر استقبال کیلئے درجنوں کارکن اور مرکزی قیادت موجود تھی۔ جن میں مرکزی صدر جناب فانوس گوجر، مرکزی جنرل سیکریٹری اختر حسین، ڈپٹی جنرل سیکریٹری عصمت شاہجہاں صاحبہ، مرکزی تنظیمی سیکریٹری جناب جاوید اختر، کسان سیکریٹری حسن عسکری، لیبر سیکریٹری صفدر حسین سندھو، نائب صدر عابدہ لیاقت، فیڈرل کمیٹی کے رکن اور مرکزی سیکریٹری مالیات محترمہ شازیہ خان، مرکزی سیکریٹری اطلاعات فرمان علی، فیصل آباد سے محمد سعید، گجرانوالہ سے صدیق گھمن، پنجاب کے صدر پروفیسر عاصم سجاد اختر، نائب صدر پروفیسر صلاح الدین اور وکلاء لیاقت نصیر اور بڑی تعداد میں کسان خواتین موجود تھیں۔ پیپلز پارٹی کے مقامی کارکن بھی عوامی ورکرز پارٹی سے اظہار یکجہتی اور جناب غلام دستگیر کے استقبال کیلئے موجود تھے۔ مرکزی قیادت جناب فانوس صاحب کی قیادت میں شام شیخوپورہ جیل پہنچ چکے تھے اور آہستہ آہستہ کارکن مختلف اضلاع سے جمع ہونا شروع ہوئے اور وقفہ وقفہ سے نعرے بازی کرتے رہے۔ شاعر شفیق احمد شفیق اور دوسرے فنکار بھی موجود تھے۔ جو پرجوش نعرے لگاتے تھے اور کامریڈ غلام دستگیر کی قربانیوں اور انقلابی جذبوں کو خراج تحسین پیش کرتے اور ظالمانہ جاگیرداری، سرمایہ داری، نوکرشاہی اور سامراج کے خلاف پرجوش نعرے لگاتے رہے۔ جیل کے عملہ نے تمام رہنماؤں اور کارکنوں کو جیل کے اندر ملاقاتوں کے لئے انتظار گاہ میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ کاغذی کارروائی میں ایک گھنٹے کی تاخیر کے بعد آخر کار غلام دستگیر صاحب جیل کے مرکزی گیٹ سے باہر آئے اور کارکنوں نے پرجوش نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ اس موقع پر کسان خواتین اور ڈیرہ سہنگل سے ان کے جدوجہد کے ساتھی کارکنوں نے پھولوں کے ہار سے ان کے گلے میں ڈالے اور گلاب کی پتیاں نچھاور کیں۔

اس موقع پر فانوس صاحب اور اختر حسین صاحب نے مختصر تقریریں کیں اور غلام دستگیر محبوب کی استقامت، جدوجہد اور حوصلہ کی خراج تحسین پیش کیا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ غلام دستگیر جیسے بہادر اور باشعور ساتھیوں سے حوصلہ پاتے ہیں اور فرسودہ جاگردارانہ و عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد تیز کریں گے۔ انہوں نے کارکنوں پر زور دیا کہ وہ پارٹی پروگرام کو عوام تک پہنچائیں اور تنظیم سازی کے عمل کو تیز کریں۔ اس موقع پر غلام دستگیر محبوب نے تمام رہنماؤں اور کارکنوں کا شکریہ ادا کیا کہ وہ دور دراز علاقوں سے ان کی استقبال کے لئے جمع ہوئے جس سے ان کے جیل کے اندر جو تکالیف اور اذیت پہنچی وہ دور ہوگئی اور ان کے حوصلہ مزید بلند ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک چھوٹے جیل سے بڑی جیل میں آئے ہیں کیونکہ یہ ملک محنت کشوں اور محنت کار عوام کیلئے ایک جیل سے کم نہیں۔

غلام دستگیر محبوب کو اکتوبر 2012ء میں دہرے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ نو کسان کارکنوں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔ مرید کے پولیس نے تقریباً 250 لوگوں پر مختلف دفعات کے تحت قتل، چوری، خون ریزی کے جھوٹے مقدمات قائم کئے تھے تاکہ انہیں ہراساں کرکے ان کے ملکیتی 125 ایکٹر زمین جو انہیں 1972ء کے زرعی اصلاحات کے نتیجے میں دی گئی تھی سے بے دخل کیا جاسکے۔ یہ زمین مشہور سرمایہ دار خاندان سہگل کی ملکیت تھی جس پر وہ 1968ء سے کاشت کررہے تھے۔ فوجی آمر ضیاء الحق کے دور میں جب سپریم کورٹ کے شریعت بینچ نے زرعی اصلاحات کو غیر اسلامی قرار دے کر آئین کے شق 254 کو معطل کیا تو دیگر بااثر جاگیردار خاندانوں کی طرح سہگل خاندان نے بھی کسانوں کو اس زمین سے بے دخل کرنا چاہا اور طرح طرح کے حربے اور ہتھکنڈے استعمال کئے لیکن کسان خاندانوں نے جب مزاحمت کیں اور اپنے بنیادی ملکیتی حق سے دستبردار نہیں ہوئے تو سہگل خاندان نے اس زمین کو ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کے مالک اور لینڈ مافیاء کے سرغنہ کے ہاتھوں غیر قانونی طور پر بیچ دیا جس نے پولیس کی مدد سے ان کسان خاندانوں کو بے دخل کرنے کیلئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیئے جب کسان خاندانوں نے زمین کے انخلاء سے انکار کیا تو انہیں مختلف مقدمات میں پھنسایا گیا اس پر بھی جب وہ نہیں مانے تو پولیس نے 16 مئی 2012ء کو ڈیرہ سہگل کا گھیراؤ کیا اور دھمکیاں دیں کہ وہ طاقت کا استعمال کریں گے اگر کسان خاندانوں نے زمین خالی نہیں کیں۔ اس پر وہ سراپا احتجاج ہوئے اور متحد ہوکر اپنی زمین پر ڈٹے رہے۔ پولیس نے آنسو گیس اور لاٹھی چارج کیا اسی دوران DSP شاہد نے براہ راست پستول سے احتجاجی مظاہرین پر فائرنگ کیں جس کے نتیجے میں گولی ایک راہگیر کو لگی اور وہ جاں بحق ہوا۔ غلام دستگیر اور ان کے ساتھی فوراً موقع پر پہنچ گئے اور خوفزدہ کسانوں، عورتوں اور بچوں کو حوصلہ دیا اور جی ٹی روڈ پر پولیس سے تصادم روکنے کیلئے کوششیں کیں پولیس تشدد سے 25 سے زائد نہتے کسان زخمی ہوئے جنھیں لے کر مرید کے ہسپتال لے جانے کیلئے جب کسان آگے بڑھے تو ان کو روک دیا گیا اور آنسو گیس برساتے رہے۔ ان میں سے کئی کسانوں کو گرفتار کیا گیا۔ 200 سے زیادہ لوگوں پر دور دراز تھانوں میں مقدمات درج کیئے گئے۔

غلام دستگیر کو اکتوبر 2012 میں گرفتار کیا گیا اور عارف ٹرک ڈرائیور جو DSP شاہد کی گولی سے مرا تھا اور ایک پولیس والے کی موت کے جھوٹے مقدمے میں گرفتار کیا گیا۔ متوفی عارف کے دو بھائی جو وقوع کے دوران ان کے ساتھ موجود تھے نے مرید کے تھانے میں اپنے بھائی کے قتل کی FIR پولیس آفیسر کے خلاف درج کرنے کی درخواست کیں۔ جو انہوں نے انکار کیا اس پر مدعی علیہ نے عدالت میں پرائیویٹ مقدمہ درج کرنے کی درخواست کیں جو منظور کیا گیا اور مقدمہ انسداد دہشت گردی کی عدالت میں چلتا رہا۔ پولیس متوفی عارف کے بھائی پر مختلف حربے استعمال کرتے رہے کہ وہ قتل کا الزام غلام دستگیر پر عائد کریں اور عدالت میں گواہی دے دیں لیکن انہوں نے انکار کیا اور پولیس مختلف حیلے بہانے سے مقدمہ کو التواء میں ڈالتے رہے آخر تمام گواہوں کے بیانات اور وکلاء کے دلائل مکمل ہوئے پولیس کی طرف سے کوئی گواہ پیش نہیں ہوا آخر میں انہوں نے شدید دباؤ ڈال کر عارف کے ایک بھائی کو خریدنے میں کامیاب ہوئے جو اپنے بیان سے منحرف ہوئے لیکن دوسرے بھائی نے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے خون کا سودا نہیں کریں گے وہ آخر تک پیروی کرتا رہا۔ آخر میں اسے بھی پولیس نے دباؤ ڈال کر مقدمہ واپس لینے کیلئے تیار کیا۔ لیکن تب تک گواہان کے بیانات اور دونوں فریقوں کے وکلاء کے دلائل مکمل ہو چکے تھے اسلئے جج نے مدعی کی درخواست کو رد کیا اور 7 جولائی کو غلام دستگیر کے وکیل پرویز عنایت ملک جو لاہور ہائی کورٹ کے جج بھی رہ چکے ہیں نے سات گھنٹے مسلسل دلائل دیئے اور مخالف وکیل نے جوابی دلائل مکمل کیئے اس کے بعد جج نے 8 جولائی کو فیصلہ سنا دیا۔

اسی دوران پولیس نے لاہور ہائی کورٹ میں ایک الگ اپیل دائر کیں لیکن غلام دستگیر اور دوسرے ملزموں کو اطلاع نہیں دی، ہائی کورٹ کے جج کے ساتھ ساز باز کر کے یک طرفہ ہمارے دوستوں کے خلاف فیصلہ دیا۔ جس کو ہمارے وکلاء نے چیلنج کیا ہے۔

دوران اسیری لینڈ مافیاء کے کارندوں نے جناب غلام دستگیر محبوب کو طرح طرح کے لالچ بھی دیئے اور کئی پیشکش بھی کیں کہ وہ ڈیرہ سہگل کے 150 ایکٹرز مین سے کسانوں کو بے دخل کریں اور ملکیتی حقوق سے دستبردار ہو جائیں تو ان کے خلاف تمام مقدمات واپس لئے جائیں گے۔ لیکن انہوں نے ہر طرح کی پیشکش کو ٹھکرا دیا حتیٰ کہ ان کو پلاٹ کی بھی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے ٹھکرا دیا۔ ان کے کچھ سیاسی ساتھیوں نے اس قسم کے پیشکش کو قبول کر لی اور جدوجہد سے ہٹ گئے جس کا انہیں بہت دکھ ہوا لیکن انہوں نے مفاہمت نہیں کی اور ثابت قدم رہے اور سرخرو ہو گئے اور اپنی زندگی کے قیمتی پانچ سال جیل میں گزارے۔

عدالتی نظام کی خرابیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے وکیل پروفیسر عنایت ملک نے کہا کہ غلام دستگیر کے یہ پانچ سال کون واپس کرے گا اس کا ڈیرہ سہگل کے تمام مرد ہاتو مقدمات میں پھنسے رہے یا اور تھانہ کچہری کے چکر لگانے پر مجبور ہوئے لیکن ان کی بہادر خواتین نے جدوجہد کو جاری رکھی۔ اس کی وجہ سے ایک خاتون ساجدہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ساجدہ جو دو بچوں کی ماں تھیں اور لیڈی ہیلتھ ورکر بھی تھی وہ غریب کسان عورتوں کا حوصلہ بڑھاتی اور ان کی دور کرنے انہیں ایک کرایہ کے قاتل کے ذریعے قتل کیا گیا۔ اسی دوران پارٹی کے صدر نے گذشتہ سال کانگریس کے بعد ڈیرہ سہگل کا دورہ کیا اور ڈیرہ کے کسانوں کو ہر طرح کی مدد اور تعاون کا یقین دلایا۔

اس عدالتی جنگ میں جناب پرویز عنایت ملک نے اہم کردار ادا کیا ان کے ساتھ لیاقت نصیر ایڈوکیٹ، نعیم شاکر، جاوید ایڈوکیٹ اور صفدر سندھو نے معاونت کیں اس پورے عرصے میں جناب عابد حسن منٹو صاحب کی رہنمائی بھی حاصل رہی۔ اس دوران پارٹی نے وقتاً فوقتاً مظاہرے بھی کیئے اور اسیر ساتھیوں غلام دستگیر محبوب، بابا جان، نور نبی اور مہر عبدالستار جو اوکاڑہ ملٹری فارم کے کسانوں کے حقوق کی جدوجہد کی پاداش میں ساہیوال جیل میں قید ہیں کی رہائی کیلئے مظاہرے کیئے گئے۔ بابا جان گذشتہ چار سالوں سے گلگت کے گاکوچ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ اُن کا جرم صرف یہ ہے کہ انہوں نے آفت زدہ لوگوں کے حقوق کیلئے آواز اُٹھائیں۔ پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ایک شخص اور اسکے بیٹے کی موت پر لوگوں نے ہنزہ علی آباد میں مظاہرے اور توڑ پھوڑ کیئے۔ جس کی وجہ سے بابا جان سمیت 16 نوجوانوں کو انسداد دہشت گردی کی عدالت سے چالیس سال کی سزا سنائی گئی۔ بعد میں گلگت بلتستان کے چیف کورٹ نے انہیں ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا اور انہیں تمام الزامات سے بری کیا لیکن بعد میں بابا جان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور الیکشن میں ممکنہ جیت سے خوفزدہ ہو کر حکومت نے چیف کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم اپیلٹ کورٹ میں اپیل دائر کیں اور نادہندہ ہاتھوں کے دباؤ کے تحت فیصلہ دیا گیا اور ان کے سزا کو برقرار رکھا گیا اور الیکشن لڑنے نہیں دیا گیا۔

اس فیصلے کے خلاف نظرثانی کی اپیل گذشتہ سال اگست میں دائر کی گئی اس پر ابھی تک کوئی سنوائی نہیں ہوئی ہے۔

ان تمام ظلم و فریادیوں کے خلاف عوامی ورکرز پارٹی نے 23 مئی 2017ء کو وفاقی کمیٹی کے فیصلے کے تحت پورے ملک بھر میں بھرپور مظاہرے کیئے اور ان ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ پارٹی کے تمام یونٹوں، کوئٹہ، کراچی، حیدر آباد، سانگھڑ، لاہور، ملتان، ٹوبہ ٹیک سنگھ، راولپنڈی، اسلام آباد میں بین الاقوامی اپیل جو کہ پارٹی کے مرکزی ترجمان جناب فاروق طارق نے جاری کیا تھا کے جواب میں 300 شخصیات جن میں 11 اراکین پارلیمنٹ، دانشور اور احباب نے دستخط کیئے اور بابا جان و دیگر اسیروں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

☆☆☆

سعید احمد ساجد اعوان مورخہ 28 جون 2017 کو ہم سے جدا ہو گئے، وہ عوامی ورکرز پارٹی ملتان کے صدر، AWP سرائیکی وسیب کے لیبر سیکریٹری، ریلوے ورکرز یونین کے مرکزی رہنما اور ساؤتھ پنجاب ورکرز فیڈریشن کے چیئرمین تھے۔

مرحوم کی عمر 70 برس تھی، ان کا تعلق ملتان سے تھا انہوں نے اپنی تعلیم بھی ملتان کے تعلیمی اداروں سے مکمل کی 1972ء میں ریلوے میں بطور جونیئر کلرک بھرتی ہوئے۔ مرحوم نے زمانہ طالب علمی سے ہی ادبی، علمی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور ترقی پسند نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لہٰذا ریلوے میں ملازمت اختیار کرنے کے ساتھ ہی ریلوے ورکرز یونین میں شامل ہو گئے اور مرزا ابراہیم کی قیادت میں ریلوے کے محنت کشوں کو منظم کرنا شروع کر دیا، وہ تمام عمر ایک دلیر، بہادر، سنجیدہ اور بے لوث لیڈر کی حیثیت سے محنت کشوں کے حقوق کی جنگ لڑتے رہے، اسی دوران ان کو ریلوے ورکرز یونین ملتان ڈویژن کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا ان کو مرزا ابراہیم کا قریبی ساتھ ہونے کا شرف حاصل تھا، اور انہوں نے

سعید احمد ساجد اعوان ایک انقلابی مزدور رہنما

رپورٹ: فرحت عباس

اپنی زندگی میں مرزا صاحب سے بہت کچھ سیکھا اور ایک عملی سیاسی کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ضیاء مارشل کے جبر کے دور میں وہ دیگر مزدور تنظیموں سے اتحاد کر کے یکم مئی کے کامیاب جلوس نکالتے رہے، میری ان سے ملاقات 1982-83 میں ہوئی اس وقت وہ ملتان میں ایک کمیٹڈ لیبر لیڈر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، میں نے ان کو پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی، میں اس وقت پاکستان سوشلسٹ پارٹی میں کام کرتا تھا جس کی قیادی سی آر اسلم اور عابد منٹو صاحب کر رہے تھے، چنانچہ انہوں نے پارٹی میں شامل ہونے میں کوئی دیر نہ کی اور اس طرح انہوں نے ملکی سیاست میں عملی طور پر PSP کے پلیٹ فارم سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ 1985-86 میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مزدور کسان کانفرنس میں ریلوے کے مزدوروں کے ساتھ بھرپور شرکت کی۔ انہوں نے مزدوروں میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ پارٹی کی طرف سے عائد کردہ فرائض بھی بخوبی انجام دیئے۔ 1987، میں خانیوال کے ریلوے گراؤنڈ میں ایک عظیم الشان لیبر کانفرنس منعقد ہوئی، جس کی کامیابی کے لئے مرحوم نے شبانہ روز محنت کی اس کانفرنس کے مقررین میں جناب عابد حسن منٹو، مرزا ابراہیم انیس ہاشمی، چوہدری فتح محمد اور غلام نبی کلو تھے۔

مرحوم ساری زندگی مستقل مزاجی کے ساتھ بائیں بازو کی سیاست سے وابستہ رہے، عابد حسن منٹو کی قیادت پر بھرپور اعتماد تھا اور منٹو صاحب بھی ان کو مرزا ابراہیم کا قریبی ساتھی اور پارٹی کے مسلسل وابستگی کی بناء پر عزت اور احترام کا درجہ دیتے تھے۔

انہوں نے ریلوے ورکرز یونین کے پلیٹ فارم سے کام کرتے ہوئے کئی دفعہ بلوچستان کا سفر کیا، وہ کئی دفعہ سبی اور کوئٹہ میں اجلاس منعقد کرتے رہے، سبی اور کوئٹہ میں گزارے گئے دنوں کا خاص طور پر ذکر کرتے تھے، ریلوے ورکرز یونین کے پرانے ساتھی جن کا تعلق کوئٹہ اور سبی سے ہے ان کو جانتے ہوں گے۔ انہوں نے مزدوروں کے ساتھ ساتھ آل پاکستان کلرک ایسوسی ایشن میں بھی کام کیا اپکا کے ایک معروف لیڈر جن کا قبل ازیں انتقال ہو چکا ہے، جناب اسحاق ساقی (مرحوم) کے ساتھ اچھے دوستانہ مراسم تھے، کچھ عرصہ پہلے انہوں نے ملتان میں دیگر دوستوں ودلاور عباس صدیقی، مصور نقوی، اشرف ساقی، شیخ شاہد، رائے ضعیف کے ساتھ مل کر ساؤتھ پنجاب ورکرز فیڈریشن کے نام سے محنت کشوں کی ایک تنظیم بنائی جس کا ان کو چیئرمین منتخب کیا گیا۔ کیونکہ گذشتہ کئی عشروں سے پاکستان میں مزدور تحریک انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، ٹریڈ یونینز کی طاقت کو کمزور کیا گیا ہے، ان کے نزدیک ایک مضبوط اور نظریاتی لحاظ سے پختہ ٹریڈ یونین تحریک وقت کی اہم ضرورت تھی جس کی بیک پر ایک انقلابی پارٹی کا ہونا ضروری ہے۔ عوامی ورکرز پارٹی کی تشکیل سے لیکر پارٹی کی دوسری کانگریس منعقدہ اکتوبر 2016ء کراچی، ہمارے شانہ بشانہ رہے، ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد وکالت شروع کر دی، لیکن ریلوے ویونین سے مسلسل رابطہ میں رہے، اور یونین کو نئے سرے سے منظم کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہے۔

اسی سال مارچ میں جب پارٹی کے صدر جناب فانوس گجر صاحب سرائیکی وسیب کے دورہ پر تشریف لائے تو اس موقع پر انہوں ین ملتان میں ایک لیبر کانفرنس کے انعقاد کے لئے بھرپور کردار ادا کیا اس لیبر کانفرنس سے مرکزی صدر کے علاوہ نائب صدر عابدہ چوہدری اور AWP سرائیکی وسیب صدر ظفر چوہدری نے بھی خطاب کیا، ماہ رمضان میں انہوں نے ملتان پارٹی کے ایک اہم ساتھی اقبال ملک کے تعاون سے ایک ہفتہ وار ----- سرکل کا اہتمام کیا جس اسٹیڈی کا عنوان سی پیک کے پاکستان اور سرائیکی علاقہ کی زرعی معیشت پر اثرات تھا۔ ملتان میں پارٹی کو تنظیمی اعتبار سے مضبوط اور نظریاتی لحاظ سے پارٹی کارکنوں کی تربیت کرنے میں ہمیشہ مصروف عمل رہتے تھے۔

مرحوم نے ایک بھرپور زندگی گزاری ان کا اچانک ہم سے بچھڑ جانا یقینی طور پر ملتان پارٹی کے لئے نا قابل تلافی نقصان ہے، ہم ان کی جدوجہد کو سرخ سلام پیش کرتے ہیں، ہم عہد کرتے ہیں کہ ان کے مشن کو مکمل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہیں گے۔

میں ANP بلوچستان کا انتہائی مشکور ہوں جو دکھ اور غم کی اس گھڑی میں ملتان پارٹی اور مرحوم کے لواحقین کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہیں۔

سندھ میں تازہ جبری گمشدگان

پنھل ساریوں...... سربراہ وائس آف مسنگ پرسنز فورم — انعام عباسی...... سندھی میگزین کے مدیر

مسعود شاہ گلن رند...... نواب شاہ کارکنان جسقم — عمران خشک...... ٹھٹھہ کارکن جسقم

شاہ جونیجو...... ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ لاڑکانہ محبوب — چانڈیو...... صحافی سندھ ایکسپریس دادو

غلام رسول برفت...... سب ایڈیٹر سندھ ایکسپریس — ظہیر برفت...... بینک آفیسر جامشورو حیدرآباد سندھ

آصف برفت...... عزیز شفیع برفت سیاسی رہنماء — جعفر میمن...... صحافی

دیدار جونیجو...... ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ — بلاول چانڈیو...... سیاسی کارکن

ولی چانڈیو...... سندھ ایکسپریس کا رپورٹر

یہ اسی ہفتے میں ہونے والی جبری گمشدگان ہیں اور ابتک ان کی گرفتاری کی ذمہ داری کسی ادارے نے قبول نہیں کی ہے۔ سندھ میں جبری گمشدگان بارے میں کام کرنے والے انسانی حقوق کے رضا کاروں کے مطابق 70 سے 75 کی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جو ابتک جبری گمشدہ ہیں، اور ان کی گرفتاری کوئی سیکورٹی ادارہ قبول نہیں کر رہا ہے۔

مشال خان کیس کی منتقلی کی درخواست کی سماعت

آج مشال خان شہید کیس کی اے ٹی سی کورٹ مردان سے منتقلی کی درخواست کی ایک بار پھر سماعت ہوئی، کازلسٹ میں ہمارا مقدمہ کیس نمبر 7، پر لگا تھا۔ آج مستغیث کے وکیلوں کے پینل کے سربراہ جناب عبداللطیف آفریدی ایڈووکیٹ، سپریم کورٹ میں پیش کی وجہ سے نہیں آئے تھے، ان کی جگہ جناب شہاب خٹک ایڈووکیٹ پینل کے دوسرے سینئر وکیل نے لے لی تھی۔ دورکنی بینچ، چیف جسٹس، جناب جسٹس یحیٰ آفریدی کے علاوہ جناب جسٹس اشتیاق ابراہیم پر مشتمل تھی۔ چیف جسٹس صاحب نے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحب مردان کی بھیجی ہوئی رپورٹ پڑھ کر سنائی، جس میں انہوں نے اینٹی ٹیررسٹ عدالت کی کارروائی بمقام مردان کو غیر موزوں قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ 57 ملزمان اور ان کے وکلاء کی اتنی کثیر تعداد کے لئے مردان نامناسب جگہ ہے جہاب شہاب خٹک ایڈووکیٹ جو سابقہ جج بھی رہ چکے ہیں، نے عدالت سے استدعا کی کہ آج چونکہ عبداللطیف آفریدی ایڈووکیٹ سربراہ وکیل مستغیث، سپریم کورٹ میں مصروفیت کی وجہ سے موجود نہیں ہیں لہٰذا بحث ملتوی فرمائی جائے۔ لیکن چیف جسٹس صاحب نے فرمایا کہ وکلائے ملزمان کو سنا جائے۔ تاکہ وہ مزید کیا کہنا چاہتے ہیں؟

اس پر ملزمان کے وکلاء میں سے ایک وکیل صاحب نے سیکشن 28 ذیلی سیکشن 2، اینٹی ٹیریریزم ایکٹ پڑھ کر سنایا۔ جس کی بنیاد پر انہوں نے عذر اٹھایا کہ اس دفعہ کے تحت صوبائی حکومت، عدالت کو باقاعدہ درخواست دے گی، کہ کیس کو ججوں، گواہان اور فریقین کی تحفظ کی خاطر کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے جو کہ اس کیس میں صوبائی حکومت نے ایسا نہیں کیا ہے، لہٰذا قانون کے اس دفعہ کو حکومت نے پورا نہیں کیا ہے۔ عدالت نے اس مقام پر جناب اے جی صاحب سے جب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ حکومت نے پہلے سے سرٹیفکیٹ، کیس کی منتقلی کے حق میں دی ہوئی ہے۔ جس پر چیف جسٹس صاحب نے فرمایا کہ پھر اگر آپ درخواست دینا چاہتے ہیں تو حکومت سے صلاح ومشورہ کر کے ہمیں بتائیں؟ اسی کے ساتھ عدالت نے حکومت سے مشورہ کے لئے اے جی صاحب کو وقت دیا۔ اس لئے جب وقفہ کے بعد عدالت دوبارہ بیٹھ گئی تو اے جی صاحب نے استدعا کی کہ ہم درخواست دیں گے، لیکن مہلت دی جائے۔ وکلائے ملازمان میں سے ایک وکیل نے پہلے تو استدعا کی کہ مردان جیل میں قدیوں کی ایک بیرک عدالت کے لئے مختص ہوسکتی ہے، لیکن عدالت نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ جس پر جناب عنایت شاہ باچا ایڈووکیٹ، وکیل ملزمان نے عدالت سے استدعا کی کہ ٹھیک ہے، ہمیں اتفاق ہے، آپ جہاں عدالت بھیجنا چاہتے ہیں، بھیج دیں۔ جس پر چیف صاحب نے فرمایا کہ، حکومت نے درخواست دینے کی استدعا کی ہے، ہم میرٹ پر قانون کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ چاہے آپ کیس کی منتقلی کی درخواست سے اتفاق کر بھی رہے ہوں، لیکن ہم پارٹیوں کے خواہشات پر نہیں جائیں گے۔ عدالت نے حکومت کو تین دن کے اندر درخواست دائر کرنے کا حکم دیا اور اس طرح کیس کی منتقلی کا نزاع آئندہ مورخہ 27 جولائی، 2017ء کو مؤخر ہوا۔

عوامی ورکرز پارٹی ضلع لاہور کی غیر معمولی کانگریس

AWP ضلع لاہور کی غیر معمولی کانگریس کا اجلاس، پارٹی کے دفتر 5، میکلوڈ روڈ پر منعقد ہوا۔ جس میں ضلع لاہور کی پارٹی کے بعض عہدیدار جو کام نہیں کر رہے تھے ان کی جگہ نئے عہدیدار منتخب کیئے گئے۔ جن میں نمبر 1: نائب صدر محمد حنیف، نمبر 2: سیکریٹری خواتین نصرت بشیر ظفر، نمبر 3: سیکریٹری اطلاعات جہانگیر سندھو، نمبر 4: سیکریٹری یوتھ منصور احمد خان، نمبر 5: سیکریٹری تعلیم وتربیت زین العابدین، نمبر 6: سیکریٹری فائنانس لیاقت نصیر، اس کے علاوہ کامریڈ توفیق اور عمران نفیس کو ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن کے طور پر منتخب کیا گیا۔

وہ کہتے ہیں

عابد شکیل فاروقی

وہ کہتے ہیں قلم سے جو لکھو وہ حکمرانوں کی رضا لکھو
وہ کہتے ہیں سچائی زہر ہے اس سے صفحے کالے نہیں کرنا

وہ کہتے ہیں حصول علم ہر اک شخص پر لازم نہیں ہوتا
وہ کہتے ہیں، علم کیا ہے، کسے کہتے ہیں، یہ ہم ہی بتائیں گے

کہ اس کی وسعتیں کتنی ہیں اسے کس حد میں رکھنا ہے
وہ کہتے ہیں کہ ان کے دیس میں ان کا کہا سچ مانا جاتا ہے

وہ کہتے ہیں نہ مانا سچ اگر اس کو زبانیں کٹ بھی سکتی ہیں
وہ کہتے ہیں وہی دکھلاؤ جو آنکھیں ہماری دیکھنا چاہیں

وہ کہتے ہیں نہ دیکھو سچ بصارت جا بھی سکتی ہے
وہ کہتے ہیں وہی بولو جو ہم دن رات کہتے، بولتے جائیں

وہ کہتے ہیں کہ ان کے دیس جو ہم دیکھیں وہی دیکھو
وہ کہتے ہیں سنو گے سچ سماعت چھن بھی سکتی ہے

وہ کہتے ہیں، جمہوری طرز اک مغرب کی لعنت ہے
مگر طرز حیات ان کی اسی مغرب کی صورت ہے

یہ سنتے آئے ہیں انصاف کی دیوی اگرچہ اندھی ہوتی ہے
مگر یہ حکم ہے ان کا عدالت ان کی اندھی لنگڑی لولی ہو

وہ کہتے ہیں کہ ان کے دیس میں قانون سازی ہو نہیں سکتی
وہ کہتے ہیں کہ ان کے دیس میں تنظیم سازی زہر قاتل ہے

وہ کہتے ہیں یہاں پر فکر سازی، ذہن سازی ایک بدعت ہے
ہوئے مجرم اگر ان کے تو سانسیں چھن بھی سکتی ہیں

سو اب دھوکے میں مت رہنا، یہ سانسیں چھن چکی کب کی
سماعت چھن چکی کب کی، بصارت جا چکی کب کی

زبانیں کٹ چکی کب کی، یہ اب بے جان دھرتی ہے
وطن ہے زندہ لاشوں کا، بے حس مردہ مکانوں کا

جنہیں آباد کرنا شاد کرنا ہے، جنہیں پہچان دینی ہے
جنہیں بے خواب نیندوں سے جگانا ہے انہیں آگاہ کرنا ہے

کسی بھی دیس کی رونق، کسی دھرتی کی زرخیزی
وہاں کے لوگ ان کے مسکراتے خواب ہوتے ہیں

چلو ڈھونڈیں انہی لوگوں کو ان کی مسکراہٹ کو
جو ان سے چھن چکی ہیں اور ان سے روٹھ بیٹھی ہیں

اور ان خوابوں کو جن کو ظالموں نے ان سے چھینا ہے

مشال خان قتل کے مقدمے میں عوامی ورکرز پارٹی پختون خواہ کے
کے صدر شہاب خٹک مقدمے کی پیروی کے بعد

سینٹ کمیٹی کی دعوت پر عابد حسن منٹو ''زرعی اصلاحات'' کیس کے
بارے میں بریفنگ کررہے ہیں

کیا زرعی اصلاحات ضروری ہیں کراچی سیمینار میں شریک بخشل تھلوا،
اختر حسین ایڈووکیٹ تاج حیدر، یوسف مستی خان، حسن عسکری

غلام دستگیر محبوب کی جیل سے رہائی پر عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی
رہنما اور دیگر اضلاع کے عہدیدار استقبال کررہے ہیں

لاڑکانہ فکری نشست میں شریک
خواتین وحضرات

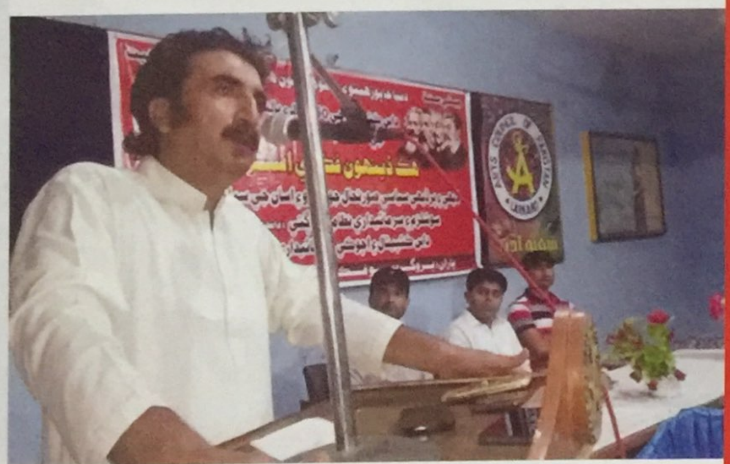

عوامی ورکرز پارٹی نیشنل کمیٹی سندھ کے صدر بخشل تھلو
لاڑکانہ فکری نشست سے خطاب کررہے ہیں